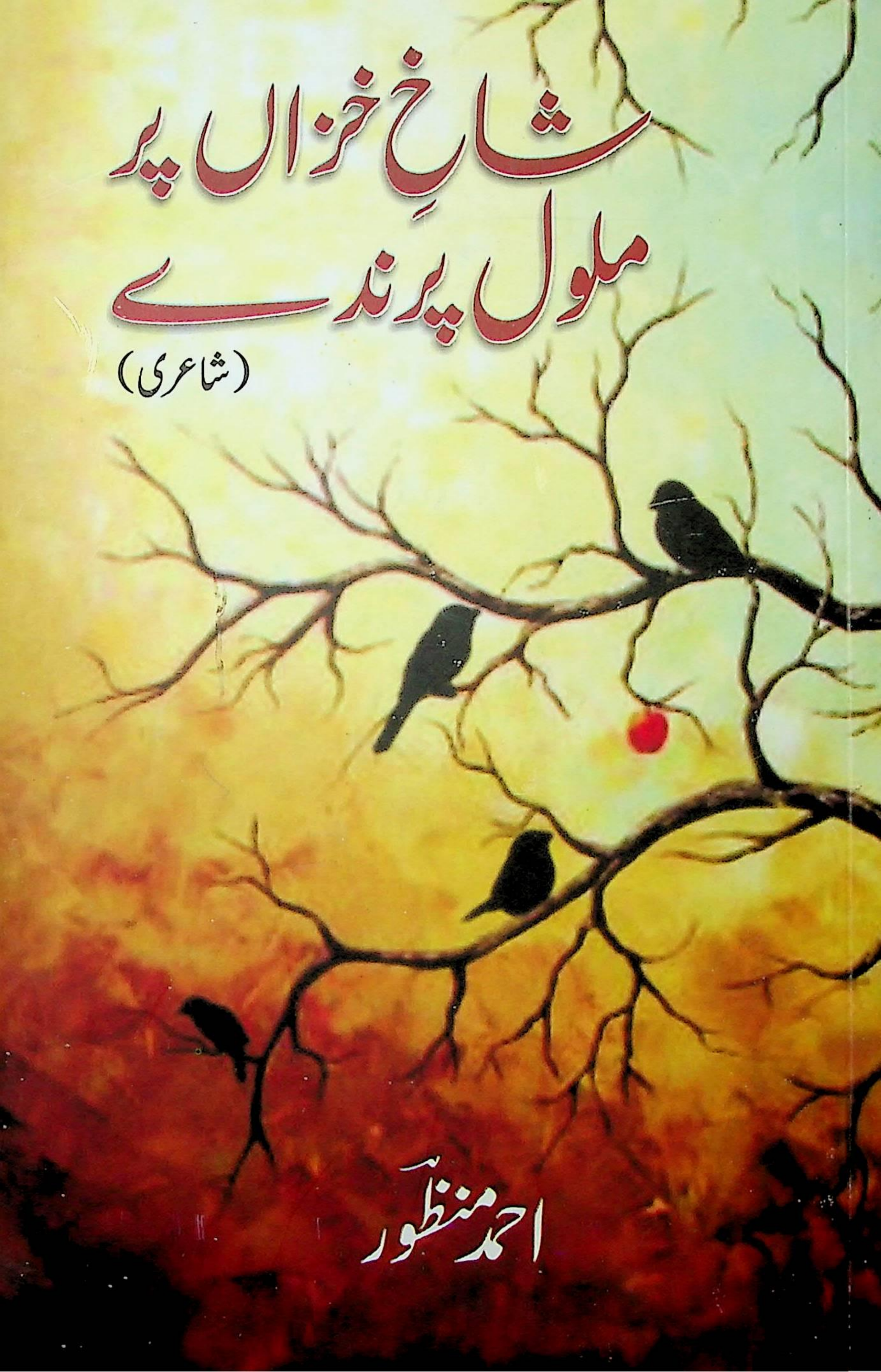
شاخِ خزاں پر ملول پرندے

(شاعری)



احمد منظور

شاخِ خزاں پر ملول پرندے

شکست و ریخت یوں کر کے قبول بیٹھے ہیں
پرندے شاخِ خزاں پر ملول بیٹھے ہیں
(احمد منظور)

شاخِ خزاں پر ملول پرندے

احمد منظورؔ

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

Shakh-e-Khazan Par Malool Parenday

by : ***Ahmad Manzoor***

House No. 09, Alamdar Colony, Chandsumma
P.O Khawaja Bagh Baramulla 193103
Contact No. : 7006345309, 9622677725
E-mail : drmanzoor78699@gmail.com

ISBN:978-93-90789-72-6

Rs.320/-

نام کتاب	:	شاخِ خزاں پر ملول پرندے
نوعیت	:	شاعری
مصنف	:	احمد منظورؔ
سالِ اشاعت	:	2021ء
قیمت	:	320 روپے
سائز	:	23x36/16
تعداد	:	500
کمپیوٹر کمپوزنگ	:	میر پرویز احمد (9906529374)
ناشر	:	احمد منظورؔ

کتاب ملنے کا پتہ:

ڈاکٹر احمد منظورؔ (7006345309)

Published by

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE

H.o.D1/16, Ansari Road, Darya Ganj , New Delhi-110002(INDIA)
B.o.3191, Vakil Street , Kucha Pandit, La l Kuan, Delhi-6 (INDIA)
Ph :45678285,45678286, 23216162, 23214465, Fax : 0091-11-23211540
E-mail : info@ephbooks.com,ephdelhi@yahoo.com
website: www.ephbooks.com

انتساب

امّی اور ابو

کے نام

جنھوں نے بہت ساری سختیاں اُٹھا کر

مجھے تعلیم کے نور سے آراستہ کیا۔

اس کا نہیں ملال کہ زخمی ہوا میں کیوں
پتھر تھے جن کے ہاتھ میں وہ پارسا نہ تھے
(احمد منظورؔ)

ڈاکٹر احمد منظورؔ
ایک تازہ کار اور نادر سخن ور

ڈاکٹر شفق سوپوری

شاعری کے لئے کوئی ضروری نہیں کہ وہ اپنی تفہیم، تحسین اور تشریح کے لئے کسی بیرونی ذریعہ کا سہارا لے۔ اگر شاعری خود اپنے تعارف اور ترسیل کی راہ استوار نہ کر سکے تو جاننا چاہیے کہ وہ شاعری نہیں کوئی اور شے ہے۔ کشمیر میں جو اردو شعراء کی نئی نسل اپنے تخلیقی امکانات کے زیر و بم سے نادر لب و لہجہ کی بازگشت سے ادبی فضا میں گونج پیدا کر رہی ہے ان میں ڈاکٹر احمد منظورؔ کی غزلیں اس خاصیت کے اعتبار سے قابل توجہ ہیں کہ وہ تمام بیرونی انسلاکات اور تلازمات سے گریز کر کے اپنے ہونے کا خود احساس دلاتی ہیں۔ ان غزلوں کی پہلی ہی قرات سے احساس ہوتا ہے کہ ان کے تخلیق کار کا قلم ادبی اقدار کا پابند ہونے کے ساتھ ساتھ فنی اقدار کے معاملے میں بھی دیانتداری کا مظاہرہ کرتا ہے۔ اس طور کی شاعری میں وجدان، تخیل اور تجربہ و مشاہدہ فنی سطح پر تخلیقی آمیزہ تیار کرنے کے بعد ہی اسے شعر کی ہیت عطا کرتے ہیں۔

ڈاکٹر احمد منظور کی شاعری پڑھ کر کہیں کہیں قاری ان کی فکری اور لسانی تازہ کاری سے چونک جاتا ہے۔ اس طرح کی تخلیقی ہم آہنگی پیدا کرنے کے لئے نہ صرف شعور کی بالیدگی کی ضرورت پڑتی ہے بلکہ یہ طرزِ بیان پامال منزلوں سے گریز کر کے نئے سنگ میل تراشنے کا بھی تقاضا کرتا ہے۔ اس طور سے احمد منظورؔ کی شاعری نئی دریافت کے

عمل سے گزر کر نئے امکانات کی طرف اپنا سفر جاری رکھنے میں ثابت قدم نظر آتی ہے۔ یہ شاعری واقعی نئے منظر نامے کے ساتھ نہ صرف اپنا رشتہ استوار کرتی ہے بلکہ اس میں اپنے انفراد اور اختصاص کو منوانے کی دلیل پیش کرنے کے ساتھ ساتھ اسے قبول کرنے کا جواز بھی پیدا کرتی ہے۔

احمد منظورؔ کی شاعری جس لسانی دروبست سے اپنا تانا بانا بنتی ہے اس میں لفظ و معنی کی ہم آہنگی کہیں بلند ہو جاتی ہے، کہیں مدھم سُروں کا احساس پیدا کرتی ہے تو کہیں اتنی گہری ہو جاتی ہے کہ زیر و بم ایک طویل لہر بن کر معنی کی سطح پر پھیل جاتا ہے اور کہیں ہم آہنگی کے اس پار ہم صوتی کی ترنگ گونجنے لگتی ہے۔ چنانچہ یہ شاعری جس طور کی تشبیہات، استعاروں اور علائم سے تعبیر ہے اس میں جس انداز سے الفاظ کو تخلیقی برتاؤ کے لئے تشبیہات، استعارات اور علائم کا جامہ پہنایا گیا ہے اس سے شاعر کی تخلیقی اپج مزید واضح ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان غزلوں کے اشعار میں کہیں کہیں انکشاف اور دریافت کی حیران کن کیفیت ملتی ہے۔ یہ بڑی وجہ ہے کہ منظور کی شاعری اپنا قاری پیدا کرنے میں خود کفیل ہے۔ میں احمد منظور کو اس شعری مجموعے کی اشاعت پر مبارکباد پیش کرتے ہوئے امید کرتا ہوں کہ اردو زبان کا سنجیدہ قاری اس کی پذیرائی میں بخل سے کام نہیں لے گا۔

ڈاکٹر شفق سوپوری

۳۰ر جنوری ۲۰۲۱ء

❄❄

احمد منظورؔ کی شاعری میری نظر میں

ڈاکٹر جمال اُویسی

غزل کی شاعری ایک بحرِ ذخار ہے۔ جتنے شعراء ہیں اتنے ہی لہجے اور مضامین بھی ہیں۔ غزل کے بعض مروج مضامین جدید زمانہ تک بجا آئے ہیں۔ یعنی غزل میں عاشق، معشوق اور رقیب کے کردار آج بھی زندہ ہیں۔ شمع محفل، پروانے وغیرہ کے مضامین بھی دہرائے جاتے ہیں۔ لیکن انہیں دہراتے رہنے سے غزل جامد رہتی ہے آگے نہیں بڑھ پاتی۔ غزل کے اندر مضامین، اسالیب کا ارتقا نہیں ہو پاتا۔ بیسویں صدی میں اُردو ادب کی دو تحریکوں نے غزل کی پوری دنیا بدل دی ہے۔ اب جو نئے شعرا سامنے آتے ہیں وہ تخیلی باتوں کے برعکس اپنے زمینی تجربوں کو غزل میں پیش کرتے ہیں۔ یقیناً جدید شاعروں نے غزل کے اندر نیا انقلاب برپا کیا ہے۔

جناب احمد منظورؔ ۲۵ سالوں سے یا اس سے پہلے سے بھی شاعری کر رہے ہیں۔ ان کی غزلیں اور نظمیں ہندو پاک کے ادبی رسائل میں شائع بھی ہوتی رہی ہیں۔

ان کی غزلوں سے منتخب یہ اشعار پیش کرتے ہوئے مجھے خوشی کے ساتھ اطمینان بھی ہے۔ یہ کسی نئی اُردو شاعری کے ظہور کی پہلی دھمک ہے:

کب یہ امید تھی بہاروں سے
ہوک اٹھے گی سبزہ زاروں سے

❖

اسے خود اپنے زیاں کی خبر نہیں منظورؔ
وہ بے خیال مرا ہم خیال کیا ہوگا

❖

اک پل کے انبساط پہ صدیوں کے اعتراض
تا عمر خشک کرتا رہا چشم تر کو میں

❖

پیمانِ وصل کرکے جہاں سے کوئی گیا
تکتا ہوں صبح و شام اُسی رہگزر کو میں

❖

ذرۂ خاک کی مانند نظر آتے ہیں
خاطر بہرہ وری شمس و قمر آتے ہیں

❖

پہلے سرداری ہوا کرتی تھی ورثہ ان کا
اب جو راشن کی قطاروں میں نظر آتے ہیں

❖

وقت نے کون سی ترکیب سے پرکھا ایسا
آپ کچھ اور تھے کچھ اور نظر آتے ہیں

❖

شکست و ریخت یوں کرکے قبول بیٹھے ہیں
پرندے شاخِ خزاں پر ملُول بیٹھے ہیں

❖

یہ کس خرابے کی جانب بڑھادیئے ہیں قدم
حصولِ منزلِ مقصود بھول بیٹھے ہیں

❖

الفاظ کے ہی شور کو حتمی نہ جانیے
اظہار خامشی میں ہیں اسرار دیکھیے

❖

لفظ کچھ اور ہی تھا کاغذ پر
آنسوؤں سے بنا ہُوا کیا ہے

❖

لوگ آنکھوں کو سینکتے گزرے
دیکھ دیوار پر لکھا کیا ہے

❖

دھوپ چھاؤں کا سفر دیکھتے ہیں
راہ لے جائے کدھر دیکھتے ہیں

❖

عہدِ رفتہ کو ہی دہراتا ہے
جو سفر بعدِ سفر دیکھتے ہیں

❖

کتنے بیمار شفاء پائیں گے
وہ اگر ایک نظر دیکھتے ہیں

❖

ایک خواہش خریدنے کے لیے
کتنے ارمان بیچ ڈالے ہیں

❖

آسماں نے جو آنکھ کھولی ہے
محوِ حیرت زمین والے ہیں

❖

بحرِ مضمون میں ہے کس کی تلاش
حاشیے پر سبھی حوالے ہیں

❖

خوف منظور آئے تو کیسے
ہم انہی حادثوں کے پالے ہیں

❖

مانا کہ کوئی ہونٹ کہیں پر ہلا نہیں
خاموشیوں کا شور مگر انتہا کا ہے

❖

منظر تھا دل خراش مری آنکھ بھر گئی
سینے میں دب کے چیخ محبت کی مر گئی

❖

دل میں کچھ ٹوٹ پھوٹ جاتا ہے
جب بھی وہ شخص یاد آتا ہے

❖

کیا کبھی ہم کلام ہوتی ہے
یہ جو تصویر تو بناتا ہے

❖

کھلونے جس کا چہرا تک رہے تھے
وہ کم سن خون میں لت پت پڑا تھا

❖

خوف کیسا ہے فضا میں ہر طرف
کیوں پرندہ شاخ سے اڑتا نہیں

❖

زندگی شام و سحر سوچ نئی
ہر قدم راہگزر سوچ نئی

❖

خامشی سطحِ سمندر پہ محیط
خود سے گویا ہے ٹھہر سوچ نئی

❖

ایک کردار کے مرجانے پر
داستان ختم نہ کر سوچ نئی

❖

اک عجب طرز کی آزادی کا دھوکا ہے ہمیں
زیرِ تعزیر بھی ہیں پاؤں میں زنجیر نہیں

❖

پہلے امید کا اک دیپ جلانا دل میں
پھر دعا کے لیے وہ ہاتھ اٹھا کر رونا

❖

فیصلہ ہوگیا ملزم کے ہی حق میں کب کا
اور ہم تکتے رہے پلڑے ہی میزانوں کے

❖

خواب صدیوں کی طوالت پر محیط
ہائے! لیکن لمحہ بھر ہے زندگی

❖

زندگی منظور جس قطرے میں تھی
آخرش اس بلبلے کا کیا ہوا

❖

آشفتہ نگاہوں سے مجھے دیکھ رہا ہے
شاید تھا کبھی میرا یہ گھر سوچ رہا ہوں

❖

اندازِ سخن کون سے معیار پہ آئے
پتھر کا کٹے کیسے جگر سوچ رہا ہوں

❖

تم دھوپ سے بچنے کی تراکیب میں گم ہو
میں سائے کو اندازِ دگر سوچ رہا ہوں

❖

ہمیں برداشت کرنا شاق گزرے
ہمارا مختلف طرزِ بیاں ہے

❖

کتنی خوش فہمیاں عروج پہ تھیں
میرے حق میں ہی فیصلہ ہوگا

❖

پھر اس کے بعد کچھ اس میں نظر نہیں آتا
جس آئینے میں تری چشمِ تر کو دیکھتے ہیں

❖

کبھی وہ عہد رفتہ لوٹ آئے
کہ جگنو چاند پیپل دیکھنے ہیں

❖

نظر مایوس لوٹی تھی کہاں سے
جو بھیگے تھے وہ آنچل دیکھنے ہیں

❖

احمد منظورؔ کے یہ اشعار ایک پوری داستان کو پردوں میں چھپائے ہوئے ہیں۔ احمد منظورؔ بے دھڑک اپنے خیالات واحساسات غزلوں کے پیکر میں پیش کررہے ہیں اور ایسے الفاظ سے غزل کے در و بست سجاتے ہیں جنہیں غزل کہنے والے غزلیت کے لحاظ سے ہاتھ لگانا نہیں چاہتے۔ یہ جناب احمد منظور کا اجتہادی ذہن ہے کہ انہوں نے غزل میں چلی آرہی لفظیات سے شعوری طور پر کنارہ کیا اور جو کچھ کہنا چاہتے ہیں اسے غزلیت کے پیمانہ پر ہی کہتے ہیں۔ ہاں جام کا تھوڑا ذائقہ بدل گیا ہے۔ مگر خیال رہے یہ جام ہی ہے، زہر نہیں۔

احمد منظورؔ جس غزل تک پہنچے ہیں وہاں تک کا راستہ جدید غزل گو شعراء مثلاً ناصر کاظمی، حامدی کاشمیری، مظہر امام، بشیر بدر، ندا فاضلی، شہریار، رفیق راز، شفق سوپوری،

وغیرہ نے ہموار کر دیا ہے۔ مظہر امام کو کشمیر کی غزلوں کے یہ اشعار کیسے بھلائے جا سکتے ہیں۔

اب کی شہر کی چاہ باقی نہیں
دل کچھ ایسا دکھا ہے ترے شہر میں

❖

ہاتھ اُٹھنے ہی کٹا چلئے یہاں کے چلئے
کیا دُعا کیسی دُعا چلئے یہاں سے چلئے

❖

ندا فاضلی کا یہ شعر نئی غزل کے ہموار کرنے کا طریقہ سکھاتا ہے۔

یہاں کسی کو کوئی راستہ نہیں دیتا
مجھے گرا کے اگر تم نکل سکو تو چلو

ڈاکٹر احمد منظورؔ درس و تدریس کے پیشہ سے نہیں طب کے پیشہ سے جڑے ہوئے ہیں۔ اس کے باوجود ان کے یہاں کمال کا ٹھہراؤ اور ضبط دکھائی دیتا ہے جو غزل کی دنیا کو چاہیے۔ انہوں نے کلاسیکی شعراء کے ساتھ جدید اُردو شاعروں کا بھی نہایت شوق کے ساتھ مطالعہ کیا ہے، جبھی ان کے اندر غزل کے رموز سمجھنے کی صلاحیت بخوبی پائی جاتی ہے۔ احمد منظورؔ ارض کشمیر کے ایسے شاعر بن کر ابھرے ہیں جو مستقبل کی ضمانت ہوں گے اور ایک روشن ستارہ بن کر افق شاعری پر جھلملائیں گے۔

۳ رجنوری ۲۰۲۱ء جمال اُویسی

صدر شعبۂ اُردو و فارسی

لال باغ، دربھنگہ ۴۔۸۴۶، (بہار)

7352284181, 7654677464

اپنی بات

ادبی ذوق اللہ کی بخشی ہوئی ایک نعمت ہے۔ اپنے محسوسات، خیالات، جذبات اور افکار کو موزوں الفاظ کے ذریعے دوسروں تک پہنچانا شاعری کہلاتی ہے۔ میری شاعری اور میرا پروفیشن دو الگ الگ راستے ہیں۔ شاعری میرا شوق اور میڈیکل پروفیشن معاش کا ذریعہ۔ شہرِ سرینگر سے تقریباً ساٹھ (۶۰) کلومیٹر کی دوری پر ضلع بارہمولہ کے ایک گاؤں چندسمہ سے میرا تعلق ہے جو قومی شاہراہ پر ہی آباد ہے۔ ایک زمیندار گھرانے میں میرا جنم ہوا، اور ابتدائی تعلیم نزدیکی سرکاری اسکولوں سے حاصل کی۔ مطالعہ کا شوق شروع سے ہی تھا۔ اُن دنوں اُردو، انگریزی و دیگر مضامین صرف جماعتیں پاس کرنے کے لیے پڑھتے تھے۔ اُردو سے شغف دسویں جماعت میں محسوس ہوا۔ علم وادب سے دلچسپی اُس وقت بڑھ گئی جب میڈیکل کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے مجھے ریاست سے باہر جانا پڑا۔ جہاں اُردو کے رسائل و دیگر ادبی کتابیں بہ آسانی پڑھنے کو ملیں، یوں شعر کہنے کا شوق پیدا ہوا۔ ابتداء میں اگرچہ میں نثری نظمیں ہی زیادہ لکھتا تھا لیکن غزل کہنے اور پھر اُسے گنگنانے کا شوق بہت تھا۔ اس اثنا میں اتفاقاً جمال اُویسی جو غالباً اُن دنوں اُردو کے لیکچرر تھے، سے ملاقات ہوئی۔ جو میرے پہلے اُستاد ثابت ہوئے۔ اُن کی نگہداشت اور سرپرستی میں میرا بہت سارا کلام ہندو پاک کے مختلف رسائل میں منظور چندسمی کے نام سے شائع ہوا۔ میرا تخلیقی سفر جو غالباً ۱۹۹۴ء سے شروع ہوتا ہے ۲۰۰۰ء تک بہت ساری غزلیں اور نظمیں میرا اچھا خاصا ادبی سرمایہ میرے پاس تھا۔ ۲۰۰۱ء میں مجھے سرکاری نوکری ملی اور پہلی تقرری لداخ میں ہوئی۔ ۲۰۰۵ء کے ایک حادثے میں میرا اُس وقت تک کہا سارا کلام ضائع ہوگیا۔ میرے پاس صرف وہی کلام باقی بچا رہا جو رسالوں میں شائع ہوگیا تھا۔ اس زیاں سے دل

بہت خراب ہو گیا۔ دیگر مصروفیات کے ساتھ ساتھ ازدواجی زندگی کی ذمہ داریاں بھی بڑھ گئیں۔ یوں تقریباً دس سال تک شعر و شاعری کے سلسلے سے منقطع رہا۔

میں شاعر یا تخلیق کار سے پہلے ایک انسان ہوں۔ وہ انسان جسے معمولی ٹھیس یا چوٹ یا توقع کے خلاف کچھ بھی ہونے سے گہری چوٹ لگتی ہے۔ آس پاس اور کشمیر کے حالات و اِنتشار سے خود کو بہت بے بس محسوس کرتا ہوں۔ جس کی چبھن اور درد مجھے بہت تڑپاتی ہے۔ جس کا اثر میری شاعری میں بخوبی محسوس کیا جا سکتا ہے۔ میرا غزل کہنے کا انداز الگ ہے۔ میں نے اپنے آس پاس کے حالات کے زیرِ اثر شاعری کی ہے۔ غزل کی بنیادی قواعد و اسلوب پھول، کلیاں، حسن کی تعریف، زلفیں، گلشن، چمن، ہونٹ، لب و رخسار، شراب و صبو، محبوب و معشوق میرے سبجیکٹ نہیں رہے ہیں۔ وجہ یہی انتشار اور کشمیر کے حالات جو بدستور ۱۹۹۰ء سے آج تک انتشار کا شکار ہیں۔

یہ میرا پہلا شعری مجموعہ ہے۔ مجھ سے زیادہ شفق سوپوری صاحب، جمال اُویسی صاحب، رفیق راز صاحب اور بہت سارے شعراء کرام میرے مجموعہ کے انتظار میں ہیں۔ میں جمال اُویسی اور خاص کر میرے موجودہ اُستاد جناب ڈاکٹر شفق سوپوری صاحب و دیگر دوست و احباب کا شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے میری حوصلہ افزائی اور پذیرائی ہمیشہ کی۔ خاص کر شفق سوپوری صاحب کا بہت ممنون ہوں کہ انہوں نے اپنا بہت سارا قیمتی وقت اپنی مصروفیات سے نکال کر مجھے اس مجموعے کو شائع کرنے میں میری رہنمائی کی۔

زیرِ نظر مجموعہ میں میری ۲۰۰۱ء سے پہلے کی چند غزلیں اور کچھ تازہ غزلیں شامل ہیں۔ ''شاخِ خزاں پر ملول پرندے'' آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ میرا کلام آپ کی قیمتی آراء کا طلبگار رہے۔ میں کہاں تک کامیاب ہوا ہوں، یہ فیصلہ آپ کریں گے۔ شکریہ

احمد منظور
بارہمولہ کشمیر

۱۰ر فروری ۲۰۲۱ء

حمد

دونوں عالم پر ہے تیری قادری پروردگار
بندگی کا مستحق بس اِک تو ہی پروردگار

رنگ و خوشبو سے گلوں کو تو کرے آراستہ
لالہ زاروں کو عطا تابندگی پروردگار

چہچہاتے ہیں پرندے بس تری توصیف میں
ہے فضاؤں میں تری ہی نغمگی پروردگار

کوہساروں کو عطا اونچائیاں تُو نے ہی کیں
آبشاروں کو روانی بخش دی پروردگار

وادیاں، کہسار، دریا، دشت بحرِ بیکراں
ذرّے ذرّے میں تری جلوہ گری پروردگار

آندھیاں، طوفان، طغیانی، تلاطم آفتیں
اور ہواؤں پر تری ہی حاکمی پروردگار

تُو اندھیروں سے نکالے ہے دنوں کی روشنی
اور کرے تعمیر دن سے رات کی پروردگار

دستِ قدرت میں ترے سب اختیار و اقتدار
بود اور نابود کی سب آگہی پروردگار

قادرِ مطلق تُو ہی، تُو مالکِ کون و مکاں
ہے تجھے حاصل بقا اور سرمدی پروردگار

کون سی شے ہے کہ جس پر آ نہیں سکتا زوال
بس تری اک ذات لیکن دائمی پروردگار

تیری مرضی سے رواں ہیں کاروانِ دو جہاں
جو تجھے منظور ہوتا ہے وہی پروردگار

❖❖❖

نعت شریف

اسمِ محمدؐ بہتر و برتر ﷺ
نورِ مجسم آپ سراسر ﷺ

فرشِ زمیں سے عرشِ بریں تک آپ کی عظمت اور آپ کی شان
صورت و سیرت سے اعلیٰ تر ﷺ

ہادیٔ اعظم بابِ عنایت خیر الوریٰ اور خیر الرسل
رحمتِ عالم شافعیٔ محشر ﷺ

شمس الضحیٰ یاسین مزمل شانِ محمدؐ کی ہے تعریف
مُحسنِ اعظم مطلعٔ انور ﷺ

محفلِ خوباں میں جن کو فضیلت حاصل ہے سب لوگوں پر
لامتناہی حُسن کے پیکر ﷺ

شاہ و گدا سب ہی جن کے در کی خاک کو بوسے دیتے ہیں
ایک برابر اعلیٰ و احقر صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم

ایک فقط ہیں آپؐ ہی جن کو اقبال و سعادت ہے معراج
آپ خُدا خوش آپؐ سے مل کر صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم

عاشق اور معشوق جہاں پر اک دوجے کے پہلو میں ہوں
کتنا حسیں ہوگا وہ منظر صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم

تشنہ لبو! آؤ چلتے ہیں گنبدِ خضریٰ کی جانب ہم
فیّاضی پر ساقیٔ کوثر صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم

وقتِ نزع ہو میرے لب پر اسمِ محمدؐ کی تسبیح
یوں ہوگا منظورؔ مقدّر صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم

❖❖❖

○

عرش سے فرش تک حوالہ گیا
گھر سے آدم کو جب نکالا گیا

عیب خوبی پہ ہو گئے غالب
بات کو اس قدر اُچھالا گیا

کشت و خوں کا سبب بنا ہی رہے
فیصلہ مدّتوں پہ ٹالا گیا

محوِ حیرت بنی ہوئی ہے ہنسی
آنسوؤں کو کہاں پہ ڈالا گیا

صبر کا امتحان لینا تھا!
پیاس سے دشت کو کھنگالا گیا

سانس لیتی ہے کون سی کروٹ
روز سکّہ مرا اُچھالا گیا

خشک زاروں سے ہی کہاں تنہا
دھوپ، کو برف سے بھی پالا گیا

دسترس میں رہے بھنور لیکن!
ایک ساحل نہیں سنبھالا گیا

خیر منظورؔ ہو جہانوں کی
آسماں تک زمین کا نالہ گیا

❖❖❖

○

کب یوں اُمید تھی بہاروں سے
ہوک اُٹھے گی سبزہ زاروں سے

قتل پھر برف کا ہوا شاید
خون بہتا ہے آبشاروں سے

وادیوں میں زمینیں بنجر ہیں
ابر لپٹے ہیں کوہساروں سے

شہر اپنا کبھی شگفتہ تھا!
اب ہے آباد سوگواروں سے

اشک لرزاں ہیں بوڑھی آنکھوں میں
چوٹ گہری لگی سہاروں سے

خیر امسال بھی زمیں کی نہیں
آسماں نے کہا اشاروں سے

تن کے توشے ہیں جھاڑیوں میں پھنسے
کون گزرا ہے خارزاروں سے

فکر کچھ بھی نہیں ہے طوفاں کی
خوف آنے لگا کناروں سے

غیر سے کیا گلہ کریں منظورؔ
زخم کھائے ہیں غم گساروں سے

❖❖❖

O

دل نشیں آس پاس ہوتا تھا
خیریت کی اساس ہوتا تھا

آج بارُود لہلہاتا ہے!
کل جہاں پر کپاس ہوتا تھا

کچھ تسلّی جو اشک دیتے تھے
کچھ غموں کا نکاس ہوتا تھا

اب کئی تلخیوں کا ہے مشروب
جو تعلق مٹھاس ہوتا تھا

داد بھی طرزِ نکتہ چینی رہی
عیب چیں فن شناس ہوتا تھا

کتنے چہرے بدلنے پڑتے تھے
وقت صورت شناس ہوتا تھا

آئینے کو ملال میں دیکھا
جب بھی خود کا قیاس ہوتا تھا

ایک تتلی ہی باولی تو نہ تھی
پھول کیا باحواس ہوتا تھا

جھوٹ کا ہے حمایتی اب وہ
جو حقیقت شناس ہوتا تھا

کچھ تو خوشبو بھی غم زدہ ہوتی
یا وہ گُل ہی اداس ہوتا تھا

اب تو معمولِ زندگی ٹھہرا
وہ جو خوف و ہراس ہوتا تھا

موسمِ دل میں انتشار ہے کیا
عام کیوں ہے جو خاص ہوتا تھا

آنکھ سے ہی پیا کئے منظورؔ
ہاتھ میں کب گلاس ہوتا تھا

❖❖❖❖

○

خراب حال میں جوشِ جلال کیا ہوگا
جواب پوچھ رہے ہیں سوال کیا ہوگا

جو دھوپ چھاؤں میں خوشبو کا جسم جل جائے
نسیمِ صبح سے گل کا ملال کیا ہوگا

بلند نیزوں پہ اپنے سروں کو ہونے دیا
صلیبِ صبر پہ دیکھیں مآل کیا ہوگا

متاعِ نور سے کتنے چراغ روشن ہیں
اُس آفتاب کو خوفِ زوال کیا ہوگا

خیال و خواب کی ترمیم بھی ضروری ہے
رہِ فراق میں چل کے وصال کیا ہوگا

وہ اک خراش پہ انگور رکھ نہیں پائے
وفورِ زخم کا اب اندمال کیا ہوگا

ہوا کے وار سے گرنے کا کوئی خوف نہیں
شجر اداس پرندوں کا حال کیا ہوگا

نگاہِ مست سے مجھ کو مرے خلاف کیا
کمالِ وصف میں اس کے مثال کیا ہوگا

اُسے خود اپنے زیاں کی خبر نہیں منظورؔ
وہ بے خیال مرا ہم خیال کیا ہوگا

❖❖❖

○

پندارِ بیکراں میں رہا عمر بھر کو میں
سمجھا بہت طویل رہِ مختصر کو میں

اک پل کے انبساط پہ صدیوں کے اعتراض
تا عمر خشک کرتا رہا چشمِ تر کو میں

ویرانیاں اُدھر ہیں اِدھر ضبطِ قید و بند
روؤں فضا کے حال پہ یا بال و پر کو میں

چلنا بھی کارِ جرم ٹھہرنا بھی ہے خطا
تخمین کس طرح سے کروں اب سفر کو میں

دردِ جگر میں روز اضافوں کی رو رہی
قائل کبھی بھی کر نہ سکا چارہ گر کو میں

ہے کیسے امتحاں میں پریشاں شعورِ ذات
دستار کو بچاؤں تو کھوؤں گا سر کو میں

پیمانِ وصل کر کے جہاں سے کوئی گیا
تکتا ہوں صبح و شام اُسی رہگزر کو میں

ہوتا جو انتشارِ خرد کے نمو کا علم
لاتا ثمر کی بات پہ کیسے شجر کو میں

منظور کوئی خوف نہیں ہے ہوائے تُند
ساحل کے اعتماد پہ کوسوں بھنور کو میں

❖❖❖

○

ذرۂ خاک کی مانند نظر آتے ہیں
خاطرِ بہرہ وری شمس و قمر آتے ہیں

کھلکھلاتے ہوئے زخموں پہ بہار آتی ہے
عکس جب آنکھوں سے اس دل میں اُتر آتے ہیں

در و دیوار پہ حیرت کا سماں ہوتا ہے
شام سے پہلے اگر لوٹ کے گھر آتے ہیں

آزمالیجئے سب ظلم و ستم کے بازو
مجھ کو برداشت کے کیا کیا نہ ہنر آتے ہیں

پہلے سرداری ہوا کرتی تھی ورثہ ان کا
اب جو راشن کی قطاروں میں نظر آتے ہیں

وقت نے کون سی ترکیب سے پرکھا ایسا
آپ کچھ اور تھے کچھ اور نظر آتے ہیں

مرہمِ وقت سے بھی جو نہ کبھی بھر پائے
اے مسیحا! لئے وہ زخمِ جگر آتے ہیں

شام کے سایوں میں منظورؔ طلسمات ہیں کیا
چھوڑ کر دیکھیے کیوں لوگ سحر آتے ہیں

❖❖❖

○

حوصلوں کے تار ڈھیلے ہو گئے
راستے کتنے نوکیلے ہو گئے

مہرباں جب تک نہ تھی منزل کوئی
راہ کے ذرّے بھی ٹیلے ہو گئے

پوچھتے ہیں آہ و زاری کا سبب
خون سے یہ ہاتھ گیلے ہو گئے

تلخیوں کے باب کھلتے ہی رہے
لفظ جتنے بھی سُریلے ہو گئے

جو حقیقت کے یہاں عکاس تھے
وقت کی گردش میں حیلے ہو گئے

آرزو دل کی ہوئی جو بامراد
مہرباں شاید وسیلے ہوگئے

کیا ہوا سے ہی کوئی سازش ہوئی
گلستاں میں پھول پیلے ہوگئے

اب عنایت کیجئے آبِ حیات
صبر کے بھی ہونٹ نیلے ہوگئے

کیا ہوا منظور ضبطِ اِتحاد
جو قبیلہ سے قبیلے ہوگئے

❖❖❖

○

آئینوں کے بیاں تمام ہوئے
عکس آہ و فغاں تمام ہوئے

کیا مسافر کو کچھ خبر نہ ہوئی؟
راستے کب کہاں تمام ہوئے؟

اک حقیقت طلوع ہوتے ہی
دور وہم و گماں تمام ہوئے

زندگی اختتام کو پہنچی
ختم کیا امتحاں تمام ہوئے؟

کون سی بات منہ سے نکلی ہے؟
دوست کیوں بدگماں تمام ہوئے؟

ہاتھ آئے وہیں خواصِ زمیں
گُم جہاں آسماں تمام ہوئے

جم گئے موسمِ فراق میں جو
کیا وہ دریا رواں تمام ہوئے؟

زرد موسم نے باہیں پھیلائیں
شکوۂ گلستاں تمام ہوئے

حشر برپا ہوا ہے کیا منظور
وحشتوں کا نشاں تمام ہوئے

❖❖❖

○

شکست و ریخت یوں کر کے قبول بیٹھے ہیں
پرندے شاخِ خزاں پر ملُول بیٹھے ہیں

یہ کس خرابے کی جانب بڑھادیئے ہیں قدم
حصولِ منزلِ مقصود بھول بیٹھے ہیں

کہیں نہ خوشبو خلش کا سبب ہی بن جائے
صبا کے لطف و کرم پر ہی پھول بیٹھے ہیں

سنا ہے خار کی جگھوں پہ پھل بھی آئے گا
اِسی اُمید پہ کتنے ببول بیٹھے ہیں

مری طرف ہی نگاہیں ہیں خیر خواہی کی
یہ اور بات وہ کن کے شمول بیٹھے ہیں

یہ خارزار بیابان دشت و صحرا اُجاڑ
اُنہیں صلہ ہے اُڑا کر جو دھول بیٹھے ہیں

پڑا ہے سابقہ منظورؔ کس زمانے سے
عقیل لوگ رجھانے جھول بیٹھے ہیں

❖❖❖

غزل

اس زندگی کے کوچہٗ و بازار دیکھئے
دھوکا دہی فریب کے اطوار دیکھئے

ہر لمحہ صورتوں کے بدلنے کی کوششیں
بڑھ کر بھی کوئی وقت سے فنکار دیکھئے

تاب و تواں بھی دیکھ دلِ ناصبور کا
اُن کی نگاہِ ناز کی بھی دھار دیکھئے

چہرے کے آب و رنگ کو دھوکا ہی جانیے
اچھا نہیں ہے آپ کا بیمار دیکھئے

چہکار کے مقام پہ ہے آہ و زار کیوں
اہلِ چمن پہ کیسے ہیں آزار دیکھئے

الفاظ کے ہی شور کو حتمی نہ جانیے
اظہار خامشی میں ہیں اسرار دیکھیے

اب چل دیے جو ہیں تو یہی دھیان میں رہے
بیٹھے ہیں راستوں میں کئی مار دیکھیے

دہلیز سے جو آئے ہیں باہر وہی قدم
رکھتے ہیں کیسی شرط پہ دستار دیکھیے

منظور دیکھنے کی اجازت نہیں اُنہیں
سانسوں کے ارتکاب کو بے کار دیکھیے

❖❖❖

○

آسماں کو دھواں سمجھتے ہیں
ہے حقیقت گماں سمجھتے ہیں

اتنے ناداں نہیں کہ جھوم اُٹھیں
وقت کے امتحاں سمجھتے ہیں

میرے الفاظ ارتباط و خلوص
آپ کیسی زباں سمجھتے ہیں

ساحلوں کی گواہیاں سچ ہیں
زورِ آبِ رواں سمجھتے ہیں

آپ اپنا دُرست مانیں گے
آپ میرا کہاں سمجھتے ہیں

چھاؤں کے گُن سراہنے والے
دھوپ کیوں رائیگاں سمجھتے ہیں

کس طبیعت کے لوگ ہیں منظورؔ
دشت کو گُلستاں سمجھتے ہیں

❖❖❖

آزمائش کا سلسلہ کیا ہے
دشتِ مجنوں کی انتہا کیا ہے

لفظ کچھ اور ہی تھا کاغذ پر
آنسوؤں سے بنا ہُوا کیا ہے

کیوں وہ اتنا حواس باختہ ہے
کچھ تو کہہ دو کہ ماجرا کیا ہے

چشمِ پُرخواب نے لہو ہوکر
دیکھ دیوار پر لکھا کیا ہے

بانٹتا ہے ہر ایک لمحہ مجھے
میرے حصے میں رہ گیا کیا ہے

عکس میرا ہے اور ہی صورت
آئینے میں یہ دھند سا کیا ہے

لمحہ لمحہ بدل رہا ہے جہاں
ایک جیسا سدا رہا کیا ہے

ربط کے رُخ بدل گئے منظورؔ
راستہ بھی مُڑا ہوا کیا ہے

❖❖❖

O

دھوپ چھاؤں کا سفر دیکھتے ہیں
راہ لے جائے کدھر دیکھتے ہیں

عہدِ رفتہ کو ہی دہراتا ہے
جو سفر بعدِ سفر دیکھتے ہیں

ہے کسی اور کی تشہیر وہاں
ہم جہاں اپنی خبر دیکھتے ہیں

ٹوٹ جاتے ہیں کئی آئینے
عکس جب دیدۂ تر دیکھتے ہیں

کوششیں کتنی ادا کرنی پڑیں
اب جو دیوار میں در دیکھتے ہیں

بھول بیٹھے ہیں پرندے لیکن
منتظر اب بھی شجر دیکھتے ہیں

کتنے بیمار شفا پائیں گے
وہ اگر ایک نظر دیکھتے ہیں

شب کے دستور کو منظور کہاں
ہم اگر دن میں قمر دیکھتے ہیں

❖❖❖

O

دخیلِ ذہن نہیں تھا نہ وہ نظر میں رہا
عجیب خوف تھا صدیوں جو بال و پر میں رہا

کہیں پہنچ کے وہ رستے بھی تھک کے بیٹھ گیا
ستم رسیدہ مسافر سدا سفر میں رہا

وہ کاٹ لینے کی ضد پر اَڑا رہا کتنا
ہمارا ہاتھ بھی شاید کسی ہنر میں رہا

کہیں یہ سازشِ ساحل کبھی ہوا برہم
سفینہ اپنے زیاں کا یونہی بھنور میں رہا

میں داستانِ سفر مختصر بیان کروں
کہیں گمانِ تحفظ کہیں خطر میں رہا

شعورِ ذات سے پوچھا جو ایک سادہ سوال
جواب البتہ لیکن اگر مگر میں رہا

وہ جس کو کھانا اجازت ہمیں نہ تھی منظور
شجر کا سارا خلاصہ اسی ثمر میں رہا

❖❖❖

○

ہجر کا محشر سجایا جائے گا
عشق کے بارے میں پوچھا جائے گا

کون کس کی کھال تھا پہنے ہوئے
آئینہ سب کو دکھایا جائے گا

یوں مری تکمیل کر دی جائے گی
آگ کو پانی میں رکھا جائے گا

پہلے گُم ہونے کہیں دیں گے مجھے
پھر مجھے ہر سمت ڈھونڈا جائے گا

کیا کہیں پیش آئے گا ٹھہراؤ بھی
یا اسی طرح سے چرخا جائے گا

سازشوں میں ہے گرفتہ آفتاب
کل یہ مغرب سے چڑھایا جائے گا

کیا وہ ہٹ دھرمی سے باز آجائیں گے
کب ہمیں انسان سمجھا جائے گا

ہم ہی ساحل سے ہٹائے جائیں گے
اور یہ دریا یونہی بہتا جائے گا

جس گھڑی منظورؔ یاد آؤ گے تم
اشک کا دریا بہایا جائے گا

❖❖❖

○

بہت خوش تھا سزا پانے سے پہلے
پرندہ جال میں آنے سے پہلے

نتیجہ ذہن میں رکھ لیجئے گا
قدم دلدل پہ ٹھہرانے سے پہلے

زیاں کچھ آپ کا بھی کم نہ ہوگا
ہمارا حوصلہ ڈھانے سے پہلے

چلو کچھ دور تک ساحل پہ ٹہلیں
حسیں منظر بدل جانے سے پہلے

گماں سا تھا اُسے کچھ آگہی کا
حسیں دھوکا کہیں کھانے سے پہلے

اُسی کے دم سے دل کش تھا گلستاں
حسیں جو گُل تھا مُرجھانے سے پہلے

غنیمت دوپہر کے قہقہے تھے
سسکتی شام کے آنے سے پہلے

میں پتھر ہوگیا منظورؔ کیسے
جُڑا تھا آئینہ خانے سے پہلے

❖❖❖

O

یہ لمحہ لمحہ پگھلنا عذاب جیسا ہے
سفر نشاط کا ہونا سراب جیسا ہے

بغور دیکھا تو آنکھوں میں خار چبھتے گئے
مجھے لگا تھا وہ چہرہ گلاب جیسا ہے

ہمی کو وقت نے پیچاک ہار پہنائے
وہ شخص اب بھی گُلِ آفتاب جیسا ہے

نہ انکشاف کی صورت نہ رازداری کوئی
سوال آپ بھی حیراں جواب جیسا ہے

اُسے جو چھُولوں تو سرزد گناہ ہوجائے
وہ جس کو دیکھتے رہنا ثواب جیسا ہے

لرزتی سانسیں نہ تخمینِ آرزو کیجئے
ابھی خیال میں کیا کیا شباب جیسا ہے

جو بار بار ہے پینے کی لت لگی منظورؔ
کسی کی آنکھ ٔیں کیا کیا شراب جیسا ہے

❖❖❖

○

نگاہوں میں بیابانی بہت تھی
سرابوں کی نگہبانی بہت تھی

عجب خاموشیاں تھیں حاشیوں پر
سرِ قرطاس طغیانی بہت تھی

پڑا کیا سکتہ چہرے کی بِنا پر
جو آئینے میں حیرانی بہت تھی

وہیں بکھرے ہیں ریلے پانیوں کے
جہاں دریا میں جولانی بہت تھی

کہاں تھی آشیانوں تک ہی محدود
پرندوں کی پریشانی بہت تھی

وہاں ہم چاہ کر بھی مر نہ پائے
جہاں مرنے میں آسانی بہت تھی

زمین پر کوئی بھی سایہ نہیں تھا
اگرچہ دھوپ تابانی بہت تھی

چراغوں نے بھی سرخم لو نہیں کی
ہواؤں میں بھی من مانی بہت تھی

حقیقت سے جو پردے اُٹھ گئے تھے
گمانوں کو پشیمانی بہت تھی

درندے مرکزی کردار ہیں اب
کہانی پہلے انسانی بہت تھی

نہ اتنا طنز کر منظورؔ مجھ پر
سمجھتا کیا میں نادانی بہت تھی

❖❖❖

○

عکس و منظر بدلنے والے ہیں
آئینوں کے لبوں پہ نالے ہیں

ایک خواہش خرِیدنے کے لیے
کتنے ارمان بیچ ڈالے ہیں

اپنی خصلت کبھی دِکھائیں گے
سانپ جو آستیں میں پالے ہیں

بول سکتا نہیں کیا سچ کوئی
کیا سبھی کی زباں پہ چھالے ہیں

ظُلمتِ شب سے بچ کے نکلے ہیں
سامنے سازشی اُجالے ہیں

آسماں نے جو آنکھ کھولی ہے
محوِ حیرت زمین والے ہیں

کون سی یاد ہے گدائی پر
آنکھ نے اشک کیوں اُچھالے ہیں

بحرِ مضمون میں ہے کس کی تلاش
حاشیے پر سبھی حوالے ہیں

خوف منظور آئے تو کیسے
ہم انہی حادثوں کے پالے ہیں

❖❖❖

عذابِ جان مرے غم گُسار ہو بیٹھے
جو رستخیز کے لیل و نہار ہو بیٹھے

کسی کی یاد کی آب و ہوا موافق ہے
جگر کے زخم جو باغ و بہار ہو بیٹھے

جہانِ شوق سے کیا کیا نہ قافلے گزرے
سبیلِ وقت کا گرد و غبار ہو بیٹھے

یہ پیچ و تاب کی صورت ہی راس آئے مجھے
کہاں سکوں کے لیے بیقرار ہو بیٹھے

نہ جانے کون سا پل یاد آگیا ہوگا
ہنسی کی بات پہ کیوں اشکبار ہو بیٹھے

یہ کس خیال کی تکمیل ہونا چاہتی ہے
ہو بت تراش بھی آئینہ دار ہو بیٹھے

کبھی بھی خود سے وہ نظریں ملا نہ پائیں گے
تمہاری بزم میں جو شرمسار ہو بیٹھے

متاعِ زیست کی منظورِ آگہی نہ رہی
کہ لمحہ لمحہ زیاں کا شکار ہو بیٹھے

❖❖❖

○

تمثیلِ خار زار ہوئے لالہ زار سب
آباد کس طریق ہوں اُجڑے دیار سب

یہ کون دل کی سیج پہ جلوہ نما ہوا
مفقود ہو رہا ہے جو صبر و قرار سب

ایسی ہوا چلی کہ بہاریں اُجڑ گئیں
آباد شہر میں ہیں سوگوار سب

مفہوم ہی بدل گئے اونچی اڑان کے
شاہین میں کرگس بھی ہوئے ہیں شمار سب

شاید ہے وقت رفتہ سے کچھ یاد آگیا
آنکھیں جو قہقہوں کی ہوئیں اشکبار سب

اتنے ہوئے فریب مری سادگی کے ساتھ
خود اپنے آپ سے بھی اٹھا اعتبار سب

کب تک کسی کی بے بسی سے مستفید ہوں
صیّاد اہتمام سے ہوں گے شکار سب

منظورؔ اندرون سمجھنا محال ہے
دیوارِ جسم پر ہیں ابھی اشتہار سب

❖❖❖❖

○

خیال و خواب کی دنیا میں اختلال ہوا
مرے سوال پہ آئینے کو ملال ہوا

ضرور آب . و ہوا کے شمول سازش تھی
خزاں سے پہلے شجر داخلِ زوال ہوا

حصارِ ضبط میں کیا کیا نہ درد رکھے تھے
بس ایک آہ سے دل کا بیان حال ہوا

کسی دُعا نے جو لشکر کی آبرو رکھی
جہاں یقین نہیں تھا وہاں کمال ہوا

خُدا کا شکر کہ سانسیں ابھی کھنکتی ہیں
تمہارے بعد نہ پوچھو جو میرا حال ہوا

اسی نشاں سے دراڑیں نکلتی جائیں گی
کہ آئینے میں نمودار ابھی جو بال ہوا

مرا بیان ہی میرا گناہ لکھا گیا
میں اپنے آپ کے ہاتھوں ہی پائمال ہوا

مجھے گماں تھا کہ ادراک میرے حق میں ہیں
جواب جس کا نہ کچھ بھی وہی سوال ہوا

غمِ حیات کی روداد ہی سنائی تھی
حضور آپ کو کس بات کا ملال ہوا

کسی سبب سے ہے تخفیفِ دردِ قلب حزیں
اگر چہ زخمِ جگر کا نہ اندمال ہوا

گرفت و گیر ہے کس غور و فکر کی منظور
یہ کیسے خواب کی تعبیر خد و خال ہوا

❖❖❖

○

فضا حیراں کہاں سے چیخ نکلی ہے
زمیں یا آسماں سے چیخ نکلی ہے

درختوں پر قفس ہر شاخ پر ہیں کیا
پرندوں کے بیاں سے چیخ نکلی ہے

ہُوا گم راہبر کس موڑ پر ایسے
بھٹکتے کارواں سے چیخ نکلی ہے

یہ کیسا درد اُٹھا ساحلوں سے اب
کہ دریائے رواں سے چیخ نکلی ہے

ملی کیسی تھپک بادِ صبا سے جو
شکستہ گلستاں سے چیخ نکلی ہے

شکایت کے سبھی لب تو مقفل تھے
خموشی کی زباں سے چیخ نکلی ہے

بظاہر قتل گاہیں بین کرتی ہیں
نہاں ماتم کناں سے چیخ نکلی ہے

نہیں منظورؔ فردا کی خبر کوئی
ابھی سوزِ نہاں سے چیخ نکلی ہے

❖❖❖

سورج کے ساتھ اپنا سفر بارہا کا ہے
تب ابتدا کا خوف تھا اب انتہا کا ہے

تقلید اس طریق ہوئی ہے یزید کی
منظر ہر ایک شہر کا کرب و بلا کا ہے

مانا کہ کوئی ہونٹ کہیں پر ہِلا نہیں
خاموشیوں کا شور مگر انتہا کا ہے

اتنی صفائی پر ہوئے مجبور کس لیے
اپنے بیاں پہ شائبہ کیسے ریا کا ہے

پھولوں نے پیرہن ہی کئے چاک آخرش
بدلا ہوا مزاج جو بادِ صبا کا ہے

اپنی طرف سے ہم نے بھی غفلت کوئی نہ کی
اب سامنا انہیں بھی نئی ابتلا کا ہے

بڑھتی رہی خلیج سدا درمیان جو
منظورؔ اور کچھ نہیں جھگڑا انا کا ہے

❖❖❖

○

رعب باقی رہا نہ لشکر کا
دیکھنا تھا کمال کنکر کا

جانتا ہے کہ جان جائے گی
حوصلہ دیکھیے سخنور کا

خیر کی منزلیں بُلاتی ہیں
قافلہ منتظر ہے رہبر کا

آفتِ زیست سے تو بچ جائیں
بعد میں سوچتے ہیں محشر کا

آئینے کو ہی سوچنا تھا بہت
چھوڑیئے کیا قصور پتھر کا

مستحکم ارادہ کا دیے ہے
توڑ دے گی غرور صرصر کا

کاش منظورؔ ہم سنبھل پاتے
تھا وہ منظر تمام ششدر کا

❖❖❖

O

کشمکش میں پڑا ہے شور و غُل
اک تماشا بنا ہے شور و غُل

گُلستان کی روش ہے آہ و بکا
پھول کی ہر ادا ہے شور و غُل

پہلے خاموشی زیرِ سیف رہی
اب نشانہ بنا ہے شور و غُل

صبح کی پُرسکون وادی میں
شام کا مرثیہ ہے شور و غُل

کھڑکیوں پر ہے بھیڑ آنکھوں کی
دیکھ باہر نیا ہے شور و غُل

خاموشی اور بھی ہوئی ارزاں
کس غرض میں بِکا ہے شور و غُل

آگیا خامشی کے جھانسے میں
نرم پڑنے لگا ہے شور و غُل

خامشی کی کہاں ہے کوئی خطا
شور و غُل سے اُٹھا ہے شور و غُل

ٹوٹ سکتا ہے بھرم سانسوں کا
کوششِ نارسا ہے شور و غُل

استفادے کی شے ہے گفت و شنید
دھونس سے کب دبا ہے شور و غُل

وزن و تخمین اب نہیں ممکن
کچھ زیادہ بڑھا ہے شور و غُل

نغمۂ جاں فزا جو تھا منظور
سوزِ بادِ صبا ہے شور و غل

دل میں اتنی فسردگی کیا ہے
بے خودی میں یہ آگہی کیا ہے

جو نبھانا نہیں وفا نہ سہی
یہ بہانہ گھڑی گھڑی کیا ہے

کون سے غم چھپا کے رکھے ہیں
یہ تبسم بھی مجلسی کیا ہے

برف جیسا وہ آفتاب ہے کیوں
یہ سُلگتی سی چاندنی کیا ہے

چین آتا نہیں کہیں بھی مجھے
اب میں سمجھا کہ دل لگی کیا ہے

خوف و دہشت بھری تھی کل کی خبر
آج کی سنسنی بنی کیا ہے

یہ نگاہیں جلی ہوئی کیوں ہیں
ان بہاروں میں آگ سی کیا ہے

موت نقصان کیا کرے منظورؔ
زندگی سے کمی ہوئی کیا ہے

❖❖❖

○

شجر کی جڑ میں جو بیٹھا ہوا ہے
وہی ڈر شاخ سے چپکا ہوا ہے

بڑی مطلب پرستی اس قدر کیوں
فرشتہ صور کیا پھونکا ہوا ہے

سمندر کو خبر کیسے نہ ہوگی!
جزیرہ آگ کا پھیلا ہوا ہے

جہاں دانہ وہیں ہیں جال پھیلے
پرندہ شاخ پر سہما ہوا ہے

فلک کی بجلیاں مجھ پر گری ہیں
ضمیرِ جسم کیا تانبا ہوا ہے

کھِلا جو گُل کہیں مُرجھا نہ جائے
کہ مالی سوکھ کر کانٹا ہوا ہے

بہت کم پڑ رہا ہے عرضِ چادر
ضرورت کا بدن پھیلا ہوا ہے

میں سمجھا آنکھ تک محدود جس کو
رگِ جاں میں مرے اُترا ہوا ہے

ابابیلوں کے لشکر ڈھونڈتے ہو
تمہارے حوصلوں کو کیا ہوا ہے

کسی صورت گزرنا ہے کہ رستہ
اگرچہ سوئی کا ناکا ہوا ہے

پہل منظورؔ اک آنسو نے کی تھی
پھر اس کے بعد جو دریا ہوا ہے

❖❖❖

○

گُلستاں ویران کیسے ہوگئے
دشت کا عنوان کیسے ہوگئے

تھا شبوں کو پہلے سے ہی اختلاف
دن بھی نافرمان کیسے ہوگئے

راستی کے جو علمبردار تھے
جھوٹ کا سامان کیسے ہوگئے

عمر بھر تھے پاسبانِ خار تم
پھول کے شایان کیسے ہوگئے

عقل سے اے دل بغاوت مول لی
اس قدر نادان کیسے ہوگئے

آنکھ کو لاحق ہوا کیسا مرض
آشنا انجان کیسے ہو گئے

بندشیں کس کو نہیں سوہانِ روح
رابطے نقصان کیسے ہو گئے

سر اُٹھایا کس جگہ پر طمع نے
حوصلے بے جان کیسے ہو گئے

بات ہے منظور غور و فکر کی
حکمراں دربان کیسے ہو گئے

❖❖❖

○

جُندِ خواہش پر مسلّط بے بسی دیکھی گئی
موت کی آغوش میں جب زندگی دیکھی گئی

گرمئ صحرا سے تپتے جسم کو تسکین تھی
ساحلِ دریا پہ بڑھتی تشنگی دیکھی گئی

گھر کے شور و غل کو آیا پیش شاید حادثہ
چیختی دیوار و در کی خامشی دیکھی گئی

صبح کے دالان میں تھی شام کی پرچھائیاں
آئینے میں عکس کی جب خستگی دیکھی گئی

کاروانِ امن کو اک سوچ پر تھا اعتماد
حیف ہے رہبر سے کیسے رہزنی دیکھی گئی

جذب ہو جائے مژہ میں یا شمولِ خاک ہو
فصلِ باراں سے نہ اُلجھن اشک کی دیکھی گئی

رنگ و خوشبو وقت کو منظور بھاتے کب تلک
زرد موسم سے کہاں گُل کی خوشی دیکھی گئی

❖❖❖

○

ہم سلامت کبھی جو گھر آئے
جو پریشاں تھے خوش نظر آئے

رات کے سانحے بھلا دیتی
کاش ایسی کوئی سحر آئے

اُن کے در سے مُراد پاتے ہیں لوگ
ہم گریباں کو چاک کر آئے

ایک وحشت کو سونپنے کے لیے
خوف کیا کیا نہ میرے گھر آئے

گھونسلوں پر تھی چھائی ویرانی
جب پرندوں کے بال و پر آئے

اک خطا کی سزا ملی کتنی
ہم کہاں سے کہاں اُتر آئے

میں دمِ مرگ تک جھلستا رہا
گو کہ رہ میں کئی شجر آئے

زندگی کے عجب سمندر میں
کبھی ڈوبے کبھی اُبھر آئے

اور منظورؔ کچھ بھی یاد نہیں
یاد وہ ہم کو اس قدر آئے

❖❖❖

○

منظر تھا دل خراش مری آنکھ بھر گئی
سینے میں دب کے چیخ محبّت کی مرگئی

اس کا نہیں ہے رنج رقیبوں نے کیا کہا
اک ہم زباں کی بات کلیجہ کتر گئی

اپنے ہی رنگ و روپ میں کھویا ہوا رہا
گُل کو کہاں خیال کہ خوشبو کدھر گئی

قبضہ جمالیا ہے مرے جسم و جان پر
آنکھوں کے راستے سے جو دل میں اُتر گئی

دن کے حوادثات میں آزار کیا نہ تھے
ایسا نہیں کہ رات ہو بہتر گزر گئی

سوئے تھے پھر تھکن کو سرہانا بنا کے ہم
کوئی خبر نہیں کہ سڑک پھر کدھر گئی

شب کا سفر طویل بہت تھا اسی لیے
اتنی دعائیں صبح میرے نام کر گئی

ایسا کسی کے جانے سے منظور ہوگیا
ویران جیسے جسم کو ہو روح کر گئی

❖❖❖

کیا وہ دریا مجھے بنائے گا
یا کہیں برف سا جمائے گا

اک شکستہ مکاں کی چوکھٹ ہوں
کوئی زنجیر کیوں ہلائے گا

اب لٹکتا رہوں گا یونہی کہیں
وہ مجھے فریم میں سجائے گا

لاکھ سر وہ جھٹکتا کیوں نہ پھرے
یاد ہوں میں بھلا نہ پائے گا

دیکھنا ہے کہ آخری لمحہ
اب مرے ہاتھ کیا تھمائے گا

ہانکتا ہے جو دہکتا سورج
اور کتنا مجھے بھگائے گا

کیا خبر ہے وہ ہم زباں منظور
ہاتھ کس بات پر چھڑائے گا

❖❖❖

○

جو طلب گارِ جستجو ہوں گے
لازمی ہے کہ سرخرو ہوں گے

آج تنہا پڑے ہیں کمروں میں
کل ہمیں بھیڑ چار سُو ہوں گے

ایک خنجر تسلّی دیتا ہے
یہ کھُلے زخم بھی رُفو ہوں گے

دوست رنجور یوں خوشی پہ مری
اتنے مغموم کیا عدُو ہوں گے

لفظ کی ذات ہی معانی ہے
آپ کتنے بھی خوش گلو ہوں گے

تلخیوں کے یوں پاسباں نہ بنیں
کتنے ارمان بے نُمو ہوں گے

آنکھ کے حق میں پھر سماعت ہے
دل جہاں محوِ گفتگو ہوں گے

برف یادوں کی جب بھی پگھلے گی
اشک تمثیلِ آب جُو ہوں گے

عزتیں اُن کی بھی اترنی ہیں
جو خریدارِ آبرو ہوں گے

وقت یکساں کبھی نہیں رہتا
ہم کہاں خود کے ہو بہ ہو ہوں گے

حُسنِ جاناں کے ہو تقابل کیا
گُل زیادہ نہ خوب رُو ہوں گے

شکوے منظور کیجئے لیکن
جب وہ غم خوار روبہ رُو ہوں گے

O

روز و شب فرقت میں کوئی امتحاں ہوتا رہا
یوں عذابِ جان ہی تسکینِ جاں ہوتا رہا

آنکھ کے چشمے سے جو دریا رواں ہوتا رہا
ایک قطرہ تھا جو بحرِ بیکراں ہوتا رہا

ہائے سمجھے ہی نہیں جو وقت کی گردش کو ہم
آرزوئے استفادہ میں زیاں ہوتا رہا

صورتِ ابہام تک کتنی غلط فہمی رہی
بات جب کھلنے لگی چہرہ عیاں ہوتا رہا

میں نے اپنی رائے سے اُس سے کیا جو اختلاف
وہ مری ہر فکر پر شعلہ بیاں ہوتا رہا

جانے کیا سازش تھی میرے جسم و جاں کے برخلاف
دھوپ کی تمثیل ہر اک سائباں ہوتا رہا

تھا گماں غالب وہ سمجھے گا مری مجبوریاں
دشمنِ جاں اس قدر کیوں ہم زباں ہوتا رہا

اُن کے آنے کی خبر ہے نامہ بر کے لب پہ ہی
فاصلہ کم دھڑکنوں کے درمیاں ہوتا رہا

لمحہ بھر ہی آنکھ سے اک عکس ٹکرایا تو تھا
اجنبی وہ شخص آخر قلب و جاں ہوتا رہا

عشق میں یہ کون سی منزل پہ تھے منظورؔ ہم
اپنی ہی تصویر پر اُن کا گماں ہوتا رہا

❖❖❖

○

دل میں کچھ ٹوٹ پھوٹ جاتا ہے
جب بھی وہ شخص یاد آتا ہے

کیا کبھی ہم کلام ہوتی ہے
یہ جو تصویر تُو بناتا ہے

جن کی تعبیر دے نہیں سکتا
خواب ایسے وہ کیوں دکھاتا ہے

روز چہرے بھی پڑھ لیا کیجئے
وقت احوال لکھتا جاتا ہے

تیری یادوں کا روز سوچوں میں
ایک بھنورا سا بھنبھناتا ہے

کیوں دعائیں قبول ہوتی نہیں
کون سے در پہ سر جھکاتا ہے

ایک جیسا کہاں رہا میں بھی
تُو بھی کتنا بدلتا جاتا ہے

آخرش وہ بھی شام ڈھلتے ہی
ایک سائے کا روپ پاتا ہے

میں ہوں منظورؔ آئینہ تیرا
مجھ سے نظریں تُو کیوں چُراتا ہے

❖❖❖

○

کہاں سے آیا وہ کیسے اُتر گیا دل میں
پھنسے ہوئے ہیں شب و روز میرے مُشکل میں

کیا جو قتل مری لاش چھاؤں میں رکھ دی
مجھے یقیں ہے کہ انسانیت تھی قاتل میں

نہیں تھا علم مری سادگی ہے جرم مرا
نگاہِ خلق سے کتنا رہا ہوں غافل میں

کسی قرار نے مجبور کر دیئے ہیں قدم
وگر نہ ایسے سفر کے کہاں ہوں قابل میں

سُرود و ساز میں شامل تھیں سسکیاں کتنی
ہمارے جیسا کوئی اور بھی تھا محفل میں

ہُوا جو سودا اواخر میں جسم و جان کا طے
کہ مُشتِ خاک بھی اپنی نہیں محاصل میں

ملا نہ کوئی جو منظور اُن کے جیسا حسیں
سو آئینے کو ہی رکھا گیا مقابل میں

❖❖❖

○

رونقِ زیست پوچھتا کیا ہے
زرد پتّوں کو پھونکنا کیا ہے

میں مسیحا جسے سمجھ بیٹھا
وہ نہیں جانتا شفا کیا ہے

آنسوؤں کی یہ بارشیں کیسی
دردِ دل کا سبب بنا کیا ہے

کوئی اُمید سر اٹھائی ہے
یہ تذبذب لگا ہوا کیا ہے

آپ کا فیصلہ قبول مگر
پوچھ لیتے مری رضا کیا ہے

زرد پتّے ہرے نہیں ہوں گے
اتنی حسرت سے دیکھتا کیا ہے

دُور تک کوئی بھی نہیں ہے اگر
اتنا مُڑ مُڑ کے دیکھتا کیا ہے

لوگ کیوں کانپتے ہوئے گزرے
راہ میں خوف سا لگا کیا ہے

کیا میں پہچان میں نہیں آتا
مجھ کو منظورؔ گھورتا کیا ہے

❖❖❖

ذکر جب بھی مرا ہوا ہوگا
رنگ اک شخص کا اُڑا ہوگا

اشک آنکھوں میں تیرتے دیکھے
ایک دریا چڑھا ہوا ہوگا

آپ جس جا پہ سوچنے بیٹھے
راستہ بھی مڑا ہوا ہوگا

جس کے دم سے شجر طرب میں رہا
وہ پرندہ بھی اُڑ گیا ہوگا

روز آہٹ پہ چونک جاتا ہوں
کچھ نہیں بس گماں رہا ہوگا

وصلِ ساحل جو ہو مقدر میں
ایک تنکا بھی آسرا ہوگا

حالِ دل لکھ دیا تھا کاغذ پر
آنسوؤں سے مٹا ہوا ہوگا

ڈھونڈنے خود کو جہاں نکلے ہیں
ریگزاروں کا سلسلہ ہوگا

ہائے! منظورؔ کیسی خواہش ہے
سوکھ کر گُل کہاں ہرا ہوگا

❖❖❖

○

مُشکل ہر ایک راہ گزر پر صدا کرے
ترکِ تعلقات جو وہ سلسلہ کرے

ملتا ہے کچھ سکون یا بڑھ جائے روگ ہی
بیمارِ دل کا دیکھئے وہ کیا دوا کرے

تقسیم ہو رہا ہوں میں لمحوں کی کاٹ سے
ہے کوئی مہرباں جو مجھے ایک جا کرے

ساحل کی سازشوں میں جو آمادگی رہے
پھر کس سے التماس کوئی ڈوبتا کرے

ایسا نہیں کہ شام کی حاجت نہیں کوئی
پہلے متاعِ صبح کوئی فائدہ کرے

ہوتا رہے وہ جتنا جفاکار غم نہیں
لیکن مرے خلوص کا بھی سامنا کرے

منظور وہ جو ذہن پہ تحریر ہوگیا
دل اس کو گنگنائے بھلا کیا بُرا کرے

❖❖❖

○

گفتگو لائقِ تائید نہیں
حرف گیری کی جو تنقید نہیں

دن کی فریاد کہاں درج ہوئی
رات کے رنج بھی تسوید نہیں

خواہشِ ترکِ تعلق سے گریز
کیوں رفاقت کی بھی تاکید نہیں

ظُلمتِ شب سے روا راہ زنی
پاسبانی یہ جو خورشید نہیں

لوٹ آنے کی توقع کیا ہو
منتظر جس کی کوئی دید نہیں

کیجیے ہم کو گُلستان بدر
خیریت کی کوئی اُمید نہیں

کیوں زمین ہی ہے نشانہ منظورؔ
آسماں پر کوئی تنقید نہیں

❖❖❖

○

دنیا ہر ایک رنگ میں الزام ہی تو ہے
یہ زندگی بھی موت کا پیغام ہی تو ہے

ہے اس کو مملکت میں بہم عمرِ لازوال
تقدیر جو مری ہے کوئی شام ہی تو ہے

اس جا سے لوٹنے میں ہیں رسوائیاں کئی
منزل تلک کا فاصلہ دوگام ہی تو ہے

کِس رُو سے جسم و جان پہ پابندیاں لگیں
ہونٹوں پہ میرے اُس کا بس اک نام ہی تو ہے

نا قُرب ہی ملا نہ ہی اُمیدِ وصل تھی
ہم پر ہماری چاہ کا الزام ہی تو ہے

یہ رنج و غم یہ زخمِ جگر کرب روز و شب
جو کچھ ملا وہ عشق کا انعام ہی تو ہے

شہرِ بتاں کو توڑ کے رکھ دے گی ایک دن
خاموش صدا اصل میں کہرام ہی تو ہے

ہر لمحہ ہورہا ہوں میں شہرِ سحر سے دُور
ختمِ سفر کی شست کوئی شام ہی تو ہے

ہوں گے ضروریات میں کل اور ہی ہجوم
کچھ دیر ہی ٹھہرنے کا ہنگام ہی تو ہے

اشعار میرے نوکِ قلم سے ٹپکتے ہیں
منظورؔ تیرے سر پہ یہ الہام ہی تو ہے

❖❖❖

سوال کرتے ہیں وہم و گماں میں حیراں ہوں
اُٹھا ہے برف سے کیسا دھواں میں حیراں ہوں

گراں ہے گزرا یہ کہنا، نظر نہیں آتی
ہوا نے چھوڑے فضا میں نشاں میں حیراں ہوں

دُعا یہ کی تھی کہ آسانیاں فراہم ہوں
مزید بڑھتے گئے امتحاں میں حیراں ہوں

نظر کی آخری حد پر جو روز دیکھتے تھے
الگ ہوئے وہ زمیں آسماں میں حیراں ہوں

یہ کیسی آب و ہوا کے اثر میں آئے ہم
مزاج لگتا ہے آہ و فغاں میں حیراں ہوں

جُدا ہے دیدۂ تر کی مرادِ آہ و بکا
الگ ہے فتنۂ سوزِ نہاں میں حیراں ہوں

نہ جانے کتنی زمینوں کا سوختہ ہوگا
سلگ رہا ہے جو آتش فشاں میں حیراں ہوں

صواب و عیب پہ جو احتساب ہونے لگے
گرفت و گیر ہے سارا جہاں میں حیراں ہوں

زمین نے کون سا ایسا عمل کیا ہوگا
خفا خفا ہے بہت آسماں میں حیراں ہوں

جہاں پہ ذرہ بھی کوہِ گراں بنا منظورؔ
رُکا پڑا ہے وہیں کارواں میں حیراں ہوں

❖❖❖

○

سفر در پیش راہِ امتحاں سے
مُرادِ زندگی سود و زیاں سے

ابھی ہیں ساتھ لیکن دیکھنا ہے
الگ کرتا ہے وہ رستہ کہاں سے

کہاں ایمان اپنا بیچ آئے
مکرنا چاہتے ہو کیوں بیاں سے؟

خموشی کی فضا تھی دونوں جانب
عجب اک شور اُٹھا درمیاں سے

اگر جذبات کو ہے رنج لاحق
نکلنا ہے مناسب داستاں سے

کہاں ہے منزلِ مقصود اپنی
شکایت ہے امیرِ کارواں سے

ابھی سب تبصرے ہیں غیر واجب
بہاروں کو گزرنا ہے خزاں سے

زمیں نے کردیا مایوس لیکن!
ابھی ہے آس باقی آسماں سے

سناتے اختلافِ رائے لیکن
ارادے تاب لائیں گے کہاں سے

کبھی قطرہ برابر بھی نہیں ہوں
کبھی تمثیل بحرِ بیکراں سے

فضا میں داستانِ بربریت!
گلوں نے درج کی آہ و فغاں سے

بیاں کیسے ہو اپنی بے گناہی
سند منظورؔ لائیں گے کہاں سے

○

چشمِ برہم سے مجھ کو تاڑ نہیں
آدمی ہوں کوئی پہاڑ نہیں

روح سے افتخار ہے ورنہ!
جسم جیسا کوئی کباڑ نہیں

عیب چہرے میں ہے کہیں شاید
آئینے میں کوئی بگاڑ نہیں

خاک چھانی ہے ریگزاروں کی
دشتِ دل سا کوئی اُجاڑ نہیں

کیوں ہیں سائے مُداخلت کے نشاں
دھوپ سے کوئی چھیڑ چھاڑ نہیں

کیوں زمیں میں ہی نقب ڈھونڈتے ہو
کیا فلک میں کہیں دراڑ نہیں

جسم تبدیل ہو یہ ممکن ہے
روح کا کیا کوئی جگاڑ نہیں

گاؤں کے لوگ گُم ہوئے ہیں کہاں
شہر میں کوئی بھیڑ بھاڑ نہیں

بات منظورؔ سنگ کی دیگر
آبگینہ کسی کی آڑ نہیں

❖❖❖

علامت ہے یہ کیسی تشنگی کی
سمندر نے بھی ظاہر بے بسی کی

ہُوا کیوں آسماں ناراض اتنا
زمیں نے کیا کہیں پھر سرکشی کی

نہیں ہے شرک سے انکار ہم کو
غرض کے معبدوں کی بندگی کی

اندھیروں سے نکل آنا تھا مشکل
مگر اک روشنی نے رہبری کی

کبھی اشکوں نے سارے راز کھولے
کہیں پر قہقہوں نے مخبری کی

سجائے ہیں بہت سے خواب لیکن
ضمانت کچھ نہیں ہے زندگی کی

کہاں پہچان اب اپنی بھی ممکن
کوئی حد ہی نہیں بے چہرگی کی

عنایت کی نظر سے دیکھ لیتے
کبھی تو لاج رکھتے عاجزی کی

تحمل جو نہ ہم منظور رکھیں
صعوبت اور ہوگی بے کلی کی

❖❖❖

بظاہر خوش بہت وہ لگ رہا ہے
درونِ ذات جو بکھرا ہوا ہے

زمیں کس شے سے اتنی تپ رہی ہے
کہ سورج جلتے جلتے بجھ گیا ہے

جسامت گل ثمر کی بڑھ رہی ہے
شجر نیچے کی جانب جھک رہا ہے

مکانِ صبر میں بل پڑ رہے ہیں
یقینِ مرگ پختہ ہو رہا ہے

رہی یہ بھول اس کی سلطنت میں
مرے سجدوں سے وہ خوش ہو رہا ہے

جو مانگی تھی وہ بارش ہو نہ پائی
کساں کے حال پر سوکھا پڑا ہے

شجر نے خود کو باندھا ہے زمیں سے
ہوا کا زور بھی ضد پر اڑا ہے

درخت اثمار سب بکھرے پڑے ہیں
اثاثہ جو بھی تھا لوٹا گیا ہے

کہانی پھر ادھوری رہ گئی ہے
فسانہ پھر کوئی اُلجھا ہوا ہے

میں خود سے بے خبر ہونے لگا کیوں
مجھے منظورؔ کیا یاد آگیا ہے

❖❖❖

○

معدوم ہو رہے ہیں زمین و زماں سے ہم
بیگانگی بڑھاتے گئے آسماں سے ہم

یوں ہی کہاں ملی ہیں یہ راحت کی ساعتیں
گزرے ہیں لمحہ لمحہ کئی امتحاں سے ہم

جس نے کبھی بھی رُخ نہ کیا منزلوں کی سمت
مانوس ہوگئے ہیں اُسی بادباں سے ہم

ہوں کتنی بھی خطائیں زمیں کے حساب میں
کرتے پھریں گے پھر بھی گلہ آسماں سے ہم

وہ قافلہ کیا کہ جس میں کسی کو خبر نہ ہو
نکلے ہیں کس مکاں کی طرف کس مکاں سے ہم

ہم بھی ہنر کشید کا ہیں آزما رہے
کیا کیا نکال پائیں گے اس خاکداں سے ہم

ہر گام کسی خوف کے سائے سے لپٹ کر
گزرے ہیں تیرے شہر کے امن و اماں سے ہم

ایسے گرے کہ اُٹھنے کی ہمت نہیں رہی
گزرے تھے خواہشوں کے کسی آسماں سے ہم

آسودگیٔ قلب کے بارے نہ پوچھیے
آئے ہیں کتنے خوف لیے گلستاں سے ہم

ہوں گے کہاں کسی کی کہانی میں جلوہ گر
اب تک نکل نہ پائے تری داستاں سے ہم

اپنے کسی بھی دوست سے جب بھی کہیں ملے
پھر لوٹ پائے ہیں جو کبھی شادماں سے ہم

وہ نام اور شخص کا لکھتا تھا ریت پر
منظورؔ کس خیال میں تھے خوش گماں سے ہم

O

راز سرِ بستہ دکھایا جائے گا
آنکھ سے پردہ ہٹایا جائے گا

درد کو سمجھیں گے عاقل بھی مخول
یوں مرا قصہ سنایا جائے گا

بچ کے نکلے گا وہ طوفاں سے مگر
نزد ساحل کے ڈبویا جائے گا

اپنی ضد سے باز کب وہ آئیں گے
کب ہمیں انسان سمجھا جائے گا

جانے کیسے دشت کا ہوگا سفر
کس بیاباں سے گزارا جائے گا

کیا کہیں ٹھہریں گے لمحہ بھر کو ہم
یا سدا ایسے ہی ہانکا جائے گا

آشیاں منظور ہوگا پھر قفس
جال میں پہلے پھنسایا جائے گا

❖❖❖

○

کیوں مجھے وہ زندگی کا حوصلہ دینے لگے
سانس لینے دل دھڑکنے کی سزا دینے لگے

غیر ممکن تھا بکھر جاتے کسی سازش سے ہم
لوگ اپنے ہی اُجڑنے کو ہوا دینے لگے

احتراماً سر جھکایا تھا کسی کے سامنے
کیا سمجھ کر جابجا حکمِ سزا دینے لگے

التجائے روشنی میں گڑگڑائے تھے بہت
وہ مجھے تحفے میں سورج دھندلا دینے لگے

خیر پھر اُس قافلے کی ہو نہیں سکتی کبھی
راہبر جس کو بھٹکنے کی ادا دینے لگے

اب ٹھہرتے ہی نہیں پاؤں کسی بھی گام پر
کون منزل سے مسلسل یوں صدا دینے لگے

کاٹ کر ہم آگئے تھے مرحلے سب ہجر کے
کیوں ہمیں پھر لوٹنے کا مشورہ دینے لگے

اپنی مرضی کی کوئی تعبیر مانگی تھی فقط
وہ مسلسل خواب کا دریا بہا دینے لگے

جانب منزل بڑھایا ہے جو میں نے اک قدم
راستے منظورؔ خود اپنا پتہ دینے لگے

❖❖❖

○

شجر پر گھونسلہ بکھرا پڑا تھا
پرندہ بے کسی میں رو رہا تھا

پرندے لوٹ آئیں گے سلامت
گماں ہر شاخ کو ایسا ہوا تھا

نگاہیں آسماں کو تک رہی تھیں
زمین پر خوف سا پھیلا ہوا تھا

نہ جانے کون سی آواز گونجی
رگوں میں خون سارا جم گیا تھا

زمینیں آگ سے لپٹی ہوئی تھیں
سمندر بادلوں میں چھپ گیا تھا

ملی ہے لاش چوراہے پر جس کی
وہ پچھلے دو برس سے گمشدہ تھا

مری یہ بھول اس کی سلطنت میں
مرے سجدوں سے وہ خوش ہو رہا تھا

کھلونے جس کا چہرہ تک رہے تھے
وہ کم سن خون میں لت پت پڑا تھا

جہاں انبار لاشوں کے لگے تھے
وہیں منظورؔ بھی اوندھا پڑا تھا

❖❖❖

○

بھول بیٹھے تھے جسے وہ درد زندہ کردیا
مہرباں نے زخمِ دل کو اور گہرا کردیا

عمر بھر پھر بھر نہ پائے ہم کسی تدبیر سے
جو خلا اک دوست کے جانے نے پیدا کردیا

دیکھ لیتے اور بھی کچھ ابتہاجِ وصل ہم
دیدۂ تر نے تو منظر کو ہی دھندلا کردیا

کیا بتائیں التفاتِ ہم نشیں کیسی رہی
تشنہ کامی دیکھ کر دریا کو صحرا کردیا

زرد موسم سے ملے سب زخم تھے تازہ ابھی
موسمِ گُل نے گلوں کا درد دُہرا کردیا

ہم تو سمجھے تھے سمندر کی طبیعت پُرسکون
خامشی کی آڑ میں طوفان برپا کردیا

عمر بھر آسودگی کے منتظر بیٹھے رہے
صبر کی امداد پر ہی بس گزارا کردیا

چاندنی کا بسط، میں نے دن کبھی مانا نہیں
بس اسی اسلوب نے منظورؔ تنہا کردیا

❖❖❖

○

عنایتوں کی آڑ میں قیامتیں بھی خوب ہیں
محبتوں کے شہر کی روایتیں بھی خوب ہیں

کبھی خزاں کی آرزو، کبھی گلوں کی جستجو
وہ بے دلی بھی ٹھیک تھی یہ چاہتیں بھی خوب ہیں

ممانعت کے قاعدے یہ بندشوں کے ضابطے
کئی ہیں خوبیاں مگر قباحتیں بھی خوب ہیں

یہ دھوپ چھاؤں کی طرح وصال و ہجر کی روش
ٹھٹھرتے موسموں میں کچھ تمازتیں بھی خوب ہیں

ستم زدوں کی بے بسی سے کوئی کیوں ہو باخبر
تعصبی خیال کی صحافتیں بھی خوب ہیں

وہ پتھروں کی بارشیں وہ آئینوں کے حوصلے
وہ دلبری بھی کم نہیں سخاوتیں بھی خوب ہیں

کہاں کہاں پہ زندگی مناہمت سے کام لے
صعوبتوں کی شرط پر سہولیتیں بھی خوب ہیں

کہیں زمیں کی سرکشی غرور کی اُڑان پر
کہیں پہ آسمان کی شرارتیں بھی خوب ہیں

جو مل گیا نصیب تھا جو نا ملا گلہ نہیں
تسلّیوں کی بات ہے قناعتیں بھی خوب ہیں

ابھی ہیں آزمائشوں کے مرحلے ہزارہا
ابھی ہماری صبر و استقامتیں بھی خوب ہیں

❖❖❖

○

وقت اپنی بات دہراتا نہیں
ایک سا رہتا سدا سایا نہیں

میں سسکتا لفظ ہوں قرطاس پر
آپ کی نظروں سے جو گزرا نہیں

ہیچ اُس دریا کی سب جولانیاں
جو سمندر میں کبھی اُترا نہیں

زخم آنکھوں میں نہ لگ جائیں کہیں
اب میں باہر کی طرف کھلتا نہیں

عکس آئینے میں جو ظاہر ہوا
اس سے پہلے تو کبھی دیکھا نہیں

خوف کیسا ہے فضا میں ہر طرف
کیوں پرندہ شاخ سے اُڑتا نہیں

کون سی تحریک کا ہے احترام
یونہی پھل تو شاخ سے گرتا نہیں

شہر بھر میں کر دیا رُسوا مجھے
وہ مرے حالات کیوں سمجھا نہیں

مجھ سے ملنے کی نہیں فرصت انہیں
دل کے رکھنے کا بھی کچھ سوچا نہیں

آپ نے کیسے نگاہیں پھیر لیں
یہ ہنر منظورؔ کو آیا نہیں

❖❖❖

○

حال پر میرے گری تھیں بجلیاں
شوق سے وہ لے رہا تھا چٹکیاں

جل رہے ہیں سازشوں میں لالہ زار
خود کشی پر گامزن ہیں تتلیاں

زندگی کے شور و غُل میں جابجا
کس قدر تنہا ہیں میری سسکیاں

کیا ہنر ہے کوئی میرے ہاتھ میں
کیوں لرزتی ہیں ہمیشہ انگلیاں

اہلِ گُل کے روز و شب پر ہے زوال
بام و در سب بن گئے ہیں سُولیاں

دورِ آخر ہے تماشا دیکھئے
اب ہواؤں میں اڑیں گی مچھلیاں

ڈھونڈنے نکلا ہوں جو ایوانِ عدل
مجھسے میں پڑ گئی ہیں پُتلیاں

ان کی بستی میں تھا جشنِ روشنی
جب ہماری جل رہی تھی بستیاں

بے حیائی رقص میں بدمست تھی
پارساؤں نے بجائی تالیاں

آپ سے ملنے کی خواہش ہے مگر
درمیاں حائل ہوئیں مجبوریاں

یاد ہم منظورؔ کس کو آگئے
کیوں لگی ہیں ہچکیوں پر ہچکیاں

❖❖❖

O

دیکھنے طورِ ازدہام آئے
چھوڑ کر مشغلے تمام آئے

درگزر جن کے جُرم صبح ہوئے
شامِ دم زیرِ قتل عام آئے

عہدِ ماضی کو چھوڑ دیجیے، کہ اب
کون گلشن سے خوش خرام آئے

تھرتھراتے ہوئے چراغوں کو
کب ہوا سے کوئی پیام آئے

شاخ سے برگ سے کلی سے نہیں
رنگ و بُو سے ہی گُل کا نام آئے

جو مصمم ہو حوصلہ تو زمیں
آسماں سے تجھے سلام آئے

حکم ہے حُسن کی اطاعت میں
خادم و بندہ و غلام آئے

تجھ کو منظور میں امام کروں
ڈھنگ کا کوئی مگر کام آئے

❖❖❖

○

طریقِ گفتگو تاویلِ نیزہ بازی تری
جگر کو زخمی کرے ہے زباں درازی تری

شعورِ ذات فریبِ نگاہِ دل میں رہے
سمجھ سکے نہ جنوں میں زمانہ سازی تری

گزندِ وقت کسی طور سہہ سکیں لیکن
شکست و ریخت کا باعث ہے بے نیازی تری

ہمارے حق میں نہیں ہے تو کیا کِیا جائے
کسی کا بخت سنوارے تو دل نوازی تری

دِل شکستہ کسی دم تو مطمئن دیکھوں
سخی ہو پست نگاہوں پہ سرفرازی تری

یہ لمحہ لمحہ جو ہر سانس گھٹتی رہتی ہیں
حسیں فریب ہے تدبیرِ جاں گدازی تری

کبھی یوں حیلۂ رسوائی، عذرِ شرم کبھی
سمجھ میں آنے لگی ہے بہانہ بازی تری

یہ کیسی راہ پہ منظور رکھ دیئے ہیں قدم
لبھا رہی ہے مرا دل خوش امتیازی تری

❖❖❖

○

سجا کے دل میں وہ کیا کیا نہ خواب آیا تھا
پھر اس کے بعد مسلسل فریب کھایا تھا

بس ایک عکس ہی اُترا تھا دل میں آنکھوں سے
جو رفتہ رفتہ مری روح میں سمایا تھا

وہ کیا عذاب تھا تارے زمیں پہ گرتے رہے
سلگ رہی تھی فضا، آسمان جلتا تھا

شکستہ جسم کے حصوں سے ہوک اُٹھتی رہی
تمہاری یاد میں جب بھی یہ دل دھڑکتا تھا

عجب خیال نے چونکا دیا تھا میرا وجود
فشارِ وقت میں کچھ بھی سمجھ نہ پایا تھا

پھر اس کے بعد سمندر سے ایک آندھی چلی
کسی کا نام جو ساحل پہ یونہی لکھا تھا

بتائیں اس سے بھی بڑھ کر ہے خود سری کوئی
میں اپنی شان کا تختہ اُلٹ کے آیا تھا

نہ جانے خوف و خطر کیسا ہانکتا تھا اُسے
وہ بار بار جو گرتا تھا پھر سنبھلتا تھا

متاعِ عمر نہ پوچھو کہاں پہ ختم ہوئی
جہاں وہ چھوڑ گئے تھے وہیں میں ٹھہرا تھا

غبارِ راہ میں غائب کہاں ہوئے منظور
پلٹ کے دیکھا تو ہر سمت کوئی صحرا تھا

❖❖❖

O

کوئی ملتا ہی نہیں درد مٹانے والا
درد دے جاتا ہے سینے سے لگانے والا

ہم نے جس شخص کو سمجھا تھا محبت کا امین
وہ ہر اک بات پہ ہے بات بڑھانے والا

عقل کو ساتھ مرے دل کا ہے دینا لازم
دوست ہوتا ہے سدا ساتھ نبھانے والا

اس کی ہر بات اثر دل پہ غضب کرتی ہے
یہی انداز ہے ظالم کا لبھانے والا

زخم ایسے بھی نہیں ہیں کہ کبھی بھر نہ سکیں
درد ایسا بھی نہیں جو نہ ہو جانے والا

حکم دیتا ہے ہواؤں کو وہ پھر آندھی کا
تتلیاں پھولوں کے ہونٹوں پہ بٹھانے والا

وہ گھڑی بھر کے لیے مجھ سے ہوا تھا رخصت
پھر نہ آیا ہی کبھی لوٹ کے جانے والا

میں نے تنہائی میں دیکھا ہے اُسے روتے ہوئے
غمزدہ لوگوں کو ہر لمحہ ہنسانے والا

وقت اِک جیسا کبھی رہتا نہیں ہے منظورؔ
دھول بن جاتا ہے پھر دھول اُڑانے والا

❖❖❖

○

زندگی شام و سحر سوچ نئی
ہر قدم راہ گزر سوچ نئی

چھاؤں اور رات کے انداز الگ
شام سے پہلے مگر سوچ نئی

خامشی سطحِ سمندر پہ محیط
خود سے گویا ہے ٹھہر سوچ نئی

مختلف سوچ ہے تاریکی کی
روشنی اور قمر سوچ نئی

جادۂ خار پہ چلنا ہوگا
منزلیں دور اگر سوچ نئی

کچھ نہ آیا ہے مرے ہاتھ ابھی
کہہ گئی گردِ سفر سوچ نئی

ایک کردار کے مر جانے پر
داستاں ختم نہ کر سوچ نئی

کیوں ہے نقصان رساں بادِ صبا
شاق میں شاخ و شجر سوچ نئی

کس کے آنے کی نِدا ہے منظورؔ
شاد ہیں شمس و قمر سوچ نئی

❖❖❖

O

کرے گی کیا مجھے بدنام دنیا
اب اتنا مت دے تو الزام دنیا

نہ جانے کون سی شے کھو گئی ہے
پریشاں حال ہے ہر گام دنیا

صداقت جب بھی آئے گی زباں پر
مچائے گی بہت کہرام دنیا

کسی کے ہاتھ میں ہے جامِ فرحت
کسی کے دست میں آلام دنیا

میں خوشبو ہوں بکھر جاؤں فضا میں
مجھے گُل کر نہ پائے رام دنیا

نہ یوں ہر بار میرا امتحاں لے
کہیں پختہ کہیں ہوں خام دنیا!

سکوں ہو جس ٹھکانے پر میّسر
وہیں منظورؔ کی ہو شام دنیا

❖❖❖

منظرِ چشم پہ امید کی تصویر نہیں
آئینہ عکس ترا قابلِ تشہیر نہیں

دل کو رنجور کیئے جائے تعصب ایسا
پھول کو عزّو شرف شاخ کی توقیر نہیں

کون بنیاد پہ کہلائے مسرّت کا جہاں
ڈھونڈ کر لائیں جو تقدیر سے دلگیر نہیں

کس طرح تیرے تخیّل کی ہو تقلید کہیں
خوش کلامی میں تری معنی و تاثیر نہیں

اک عجب طرز کی آزادی کا دھوکا ہے ہمیں
زیرِ تعزیر بھی ہیں پاؤں میں زنجیر نہیں

گردشِ وقت سے وہ قہرِ قیامت اُبھرے
منزلیں حیراں ہیں کیوں راہ پہ رہگیر نہیں

عہد ماضی کی خلش سے جو جواں ہوتا ہے
کارگر ایسے مرض پر کوئی اکسیر نہیں

خوف و دہشت کی فضاؤں میں ہیں مغموم سبھی
آج پُرامن کہیں وادیٔ کشمیر نہیں

اس قدر شعر و سخن میرا نہ پرکھا جائے
دیکھ منظورؔ میں غالبؔ نہیں ہوں میرؔ نہیں

❖❖❖

○

پاس آکر مرے وہ پھول تھما کر رونا
ہائے اس کا مجھے سینے سے لگا کر رونا

پہلے اُمید کا اک دیپ جلانا دل میں
پھر دُعا کے لیے وہ ہاتھ اُٹھا کر رونا

یہ بھی تو عشق کی اک خاص نشانی ہوگی
چاند تاروں سے نگاہوں کو ملا کر رونا

وصل کی رات کٹے آج بھی تنہا تنہا
آج خوابوں کو نگاہوں سے مٹا کر رونا

جب گزرتی ہو محبت کے گلوں پر پت جھڑ
تم بھی گلشن کوئی آنگن میں سجا کر رونا

خار تو خار تھے پھولوں سے بھی وہ زخم ملے
خواہشوں کو بھی پڑا دل میں دباکر رونا

لوگ تو عشق و محبت بھی خطا مانتے ہیں
اپنے اطراف کی ہر شئے کو بھلاکر رونا

ڈھونڈنے پر بھی نہ پایا کوئی اپنا منظورؔ
اب مقابل کوئی آئینہ سجاکر رونا

❖❖❖

○

آرزو کے چراغ جلنے دے
خواہشِ دل ابھی مچلنے دے

کون بچھڑا کہاں پہ دیکھ تو لوں
رابطوں کا پتہ تو چلنے دے

روک مت کمسنوں کے قدموں کو
بادلوں پر انہیں ٹہلنے دے

گھر سے باہر نکلنا ٹھیک نہیں
حادثوں کی ہوا بدلنے دے

رات ٹھنڈی نہ ہونے پائے کہیں
چاندنی کو ذرا اُبلنے دے

اپنی شعلہ طراز آنکھوں میں
عکس و پیکر مرا پگھلنے دے

ایک ہی سمت کب تلک دوڑے
راہ دریا کو بھی بدلنے دے

چال ہم بھی چلیں نئی منظورؔ
سازشوں کو یوں ہاتھ ملنے دے

❖❖❖

○

خواب کیا کیا نہ دکھائے تھے گُلستانوں کے
اب حوالے جو کیا مجھ کو بیابانوں کے

فیصلے وقت کے دربار میں ہوتے آئے
دور کیا کیا نہ ملے خاک میں سلطانوں کے

تُند کیا سُست ہواؤں سے لرز اُٹھتے ہیں
پیڑ کمزور بہت ہوتے ہیں گلدانوں کے

بیچ آتا ہے وہ ہر روز آبرو اپنی
بوجھ اُترے ہی نہ لاچاری میں تاوانوں کے

بھانپ لیتے ہیں جو ساحل کے ارادے محکم
حوصلے پست ہوئے جاتے ہیں طوفانوں کے

خواب رکھتا ہے مری فکر کی بالائی میں
اور تعبیر کہیں گوشہ میں تہہ خانوں کے

فیصلہ ہوگیا ملزم کے ہی حق میں کب کا
اور ہم تکتے رہے پلڑے جو میزانوں کے

روح تک خوف کے آثار اتر جاتے ہیں
صورتِ حال جو لکھتا ہے وہ زندانوں کے

پھر وہ منظورؔ پہ اک حکمِ سزا تھوپ گیا
سر جھکائے جو رہا پیش تھا فرمانوں کے

❖❖❖

○

گردشوں کی چاک پر ہے زندگی
بے ثباتی سر بسر ہے زندگی

کھلکھلائیں کس خوشی میں شاخ و گُل
خوف کے زیرِ اثر ہے زندگی

شام کے سایوں سے راحت کی طلب
اک جھلستی دوپہر ہے زندگی

وصل کا لمحہ کبھی آیا نہیں
میں اِدھر ہوں اور اُدھر ہے زندگی

کیا خبر کس وقت بدلے گا مزاج
جس ہوا پر منحصر ہے زندگی

خواب صدیوں کی طوالت پر محیط
ہائے! لیکن لمحہ بھر ہے زندگی

جھولنا ہی ہے مقدّر آخرش
بے بسی کے دار پر ہے زندگی

مختصر منظور اتنی داستاں
حادثوں کی رہگزر ہے زندگی

❖❖❖

O

تلخ ہے گفتار ایسا کیا ہوا
نرم پھولوں کا وہ لہجہ کیا ہوا

مسکراہٹ کے دیے کب بُجھ گئے
خیریت کا استعارہ کیا ہوا

کون سے حالات پر بے بس ہوئے
آخرش حرفِ تمنّا کیا ہوا

فکرِ فردا حیف تم کو کچھ نہیں
عہدِ ماضی کا حوالہ کیا ہوا

کون سی منزل کی جانب ہیں قدم
ہم نوائی کا ارادہ کیا ہوا

کتنی لاشوں کی ہوئی پہچان پھر
آج دن کا کل خلاصہ کیا ہوا

اب یہاں دستور ماتم داریاں
رنگِ رفتہ کا وہ میلہ کیا ہوا

آئینے کی چشمِ حیراں سے سوال
وہ مرا مانوس چہرہ کیا ہوا

زندگی منظور جس قطرے میں تھی
آخرش اس بلبلے کا کیا ہوا

❖❖❖

○

استطاعت کے مطابق ہی سفر رکھتے ہیں
جو تعاقب میں مرے شمس و قمر رکھتے ہیں

تم ہواؤں پہ ہی الزام لگاتے رہنا
ہم چراغوں کے بھٹکنے کی خبر رکھتے ہیں

تجربہ چاہیے یہ بات سمجھنے کے لیے!
لوگ یونہی تو نہیں دیدۂ تر رکھتے ہیں

دیدۂ شوق حقیقت سے شناسا کرلیں
پھول کانٹوں کی نگہبانی میں گھر رکھتے ہیں

لفظ کی ہیئت و دھج کا ہی کہاں پاس اُنہیں
حرف کے زیر و زبر کی بھی خبر رکھتے ہیں

مسئلہ اور پرندے ہی نہ لوٹ آئیں کبھی
اپنی بانہوں کو تو پھیلائے شجر رکھتے ہیں

قہقہوں سے یوں رُجھانے کی نہ کوشش کیجئے
ہم مصیبت میں بھی ہنسنے کا ہنر رکھتے ہیں

بعد مدت کے یہ کیکر سے جواب آیا ہے
بے ثمر پیڑ کہاں کوئی ثمر رکھتے ہیں

کتنے مشتاق طلب گارِ نظر ہیں ان کے
دیکھنا ہے کہ کرم کون سے سر رکھتے ہیں

اتنا حساس حوادث نے بنایا ہے ہمیں
خیر اندیش پہ بھی شک کی نظر رکھتے ہیں

صاف گوئی کے نتیجے سے بھی واقف ہوں گے
لوگ بے کار ہی کیا دار پہ سر رکھتے ہیں

پہلے پلکوں پہ وہ منظورؔ بٹھا لیتے تھے
دیکھنا ہے کہ ہمیں آج کدھر رکھتے ہیں

○

چشمِ پُر آب میں سمندر تھا
وجہِ تعذیب دوشِ منظر تھا

راہبر کی بس ایک لغزش تھی
اور گمراہ لاؤ لشکر تھا

نعرہَ حق کا پاسدار جو تھا
دار کے شست پر وہی سر تھا

عہدِ جاناں پہ اعتبار کیا
دشت و صحرا مرا مقدر تھا

لمحہ بھر بھی ٹھہر نہ پائے کہیں
وقت کی پیٹھ میں جو خنجر تھا

بس تسلی اُچھال دی میں نے
ہاتھ پھیلائے اک گداگر تھا

دیر اک آبجو سے ملنے کی تھی
سامنے اک بڑا سمندر تھا

آپ مایوس لوٹ کیوں آئے
سرِ بازار سب میسر تھا

نیند اک بار بھی نہیں آئی
روز کانٹوں پہ اپنا بستر تھا

مہرباں ہے میرا خدا مجھ پر
ورنہ منظورؔ طرزِ ابتر تھا

❖❖❖

○

کیسے ہوں نگہبانِ شجر سوچ رہا ہوں
کب شاخ پہ آئیں گے ثمر سوچ رہا ہوں

اک شب میں مکمل تو کبھی ہوتا نہیں ہے
کس نقد سے گزرا ہو قمر سوچ رہا ہوں

آشفتہ نگاہوں سے مجھے دیکھ رہا ہے
شاید تھا کبھی میرا یہ گھر سوچ رہا ہوں

اندازِ سخن کون سے معیار پہ آئے
پتھر کا کٹے کیسے جگر سوچ رہا ہوں

دورانِ سفر ہوں نہ تہی دست کہیں پر
کیا کیا ہو مرا رختِ سفر سوچ رہا ہوں

تم دھوپ سے بچنے کی تراکیب میں گُم ہو
میں سائے کو اندازِ دگر سوچ رہا ہوں

ہنگامۂ غم میں جو کہیں بھول گئے تم
منظورؔ وہی شام و سحر سوچ رہا ہوں

❖❖❖

○

شکستہ حال باغ و باغباں ہے
گُلِ نورستہ پہ آہ و فغاں ہے

نکل پائے نہ شب کی وحشتوں سے
سحر کی جستجو کیا رائیگاں ہے

طبیعت کو اُداسی راس آئے
شگفتہ زندگی بارِ گراں ہے

جسے ہم چاہ کر بھی ڈھا نہ پائے
وہی دیوار اپنے درمیاں ہے

مسافر کو سنبھلنے کی ہے خواہش
مگر یہ راستہ رُکتا کہاں ہے

مصنف زخم کی تعبیر کے ہیں
ہمارا مختلف طرزِ بیاں ہے

حقیقت کون سی افشا ہوئی جو
خرد پر سایۂ وہم و گماں ہے

اُسے منظورؔ جو بھی نام رکھ دیں
نظر کی آخری حد پر دھواں ہے

❖❖❖

○

سنگ کی زد میں آئینہ ہوگا
خواب آنکھوں سے بہہ رہا ہوگا

سالہا سال سے جو طے نہ ہوا
چند لمحوں کا فاصلہ ہوگا

کتنی خوش فہمیاں عروج پہ تھیں
میرے حق میں ہی فیصلہ ہوگا

چیختی ہے عجیب خاموشی
پھر نیا کوئی حادثہ ہوگا

منزلیں بھی الگ ہوئی ہوں گی
راستہ جب جُدا ہوا ہوگا

لوٹ کر جب پرندے آئیں گے
پیڑ تو سوکھ بھی گیا ہوگا

اس سے بڑھ کر درندگی کیا ہو
بھیک انصاف مانگتا ہوگا

پھول اپنے تمام وصف و شرف
نام خوشبو کے کردیا ہوگا

حدِ محفوظ سے ادھر منظورؔ
خواہشِ دل کا کیا ہوا ہوگا

❖❖❖

پرندے خواب میں شاخ و شجر کو دیکھتے ہیں
شکستگانِ قفس بال و پر کو دیکھتے ہیں

تہِ نشاط یہ کیسا طلسم ہے پنہاں
مغنیوں میں کبھی نوحہ گر کو دیکھتے ہیں

ہمیں سے پوچھ وجود و فنا کا بھید ہے کیا
بہت قریب سے ہم خشک و تر کو دیکھتے ہیں

پھر اس کے بعد کچھ اس میں نظر نہیں آتا
جس آئینے میں تری چشمِ تر کو دیکھتے ہیں

ہم اہلِ حیرتِ صبح و مسا دریچے سے
عجب مدار میں شمس و قمر کو دیکھتے ہیں

ہماری سوچ کے پہرے پہ بیٹھنے والو
ہمیں خبر ہی نہیں ہم کدھر کو دیکھتے ہیں

نہ جانے کون سی آفت کا پیش خیمہ ہے
جو شاخِ شام پہ گردِ سفر کو دیکھتے ہیں

یہ ہم کلام بھی ہوسکتے ہیں کبھی ہم سے
اسی گمان میں دیوار و در کو دیکھتے ہیں

شبِ وصال یہی دیکھنا ہے اب منظورؔ
وہ کس نظر سے ہماری نظر کو دیکھتے ہیں

❖❖❖

○

خوابِ زرّیں بکھر گیا شاید
رنگ گُل سے اُتر گیا شاید

اختلافِ خیال کے باعث
رابطوں تک اثر گیا شاید

دُھول بھی رقص کر کے بیٹھ گئی
قافلہ بھی گزر گیا شاید

منزلِ شوق مل نہ پائی کبھی
رائیگاں سب سفر گیا شاید

آنکھ مشغول گریہ زاری رہی
شوق دل میں ہی مر گیا شاید

مرہمِ اندمال رہنے دیں
زخمِ دل آپ بھر گیا شاید

تھا جو دریا کی راحتوں کا سبب
وہ سمندر بپھر گیا شاید

طفلگی قلب میں ہنوز وہی
یہ گماں تھا سُدھر گیا شاید

رقتِ قلب تھم گئی منظورؔ
بارِ غم کچھ اُتر گیا شاید

❖❖❖

○

عکس و منظر بدلنے والے ہیں
آئینوں کے لبوں پہ نالے ہیں

ایک خواہش خریدنے کے لیے
کتنے ارمان بیچ ڈالے ہیں

اپنی خصلت کبھی دکھائیں گے
سانپ جو آستیں میں پالے ہیں

بول سکتا نہیں کیا سچ کوئی
کیا سبھی کی زباں پہ چھالے ہیں

آسماں نے زبان کھولی ہے
محوِ حیرت زمین والے ہیں

ظلمتِ شب سے بچ کے نکلے ہیں
سامنے سازشی اُجالے ہیں

کون سی یاد ہے گدائی پر
آنکھ نے اشک کیوں اُچھالے ہیں

بحرِ مضمون میں ہے کیسی تلاش
حاشیے پر سبھی حوالے ہیں

خوف منظورؔ اب نہیں کوئی
ہم انہی حادثوں کے پالے ہیں

❖❖❖

○

سُخن پرور جگر زخما رہے ہیں
سزا بے جرمی کی ہم پا رہے ہیں

تپش صحراؤں کی کچھ کم نہیں تھی
سمندر بھی ہمیں دہکا رہے ہیں

عجب تھی محفلِ ہستی کی رونق
جو شاداں تھے وہی پچھتا رہے ہیں

جو آخر باعثِ شرمندگی ہوں
خیال ایسے کہاں سے آ رہے ہیں

پذیرائی ہے اب تکذیب کی یوں
حقیقت سے بھی دھوکا کھا رہے ہیں

نہیں پہچان کا جو خوف کوئی
وہ چہرے کیوں بدلتے جا رہے ہیں

کبھی کام آئے گا یہ پھڑ پھڑانا
پرندوں کو قفس سمجھا رہے ہیں

دراڑیں ہیں ادھر سوکھی زمیں میں
یہ بادل اس طرف کیوں جا رہے ہیں

تکلّم ریز ہیں منظورؔ پتھر
مقابل آئینے کیوں آ رہے ہیں

❖❖❖

O

زِشت کی صورت حسیں منظر کرے
اب شکایت کیا دل مضطر کرے

گفتگو کی کوششیں سب رائیگاں
خامشی دیوار میں کب در کرے

ذکر ذرّے کا میں جب بھی چھیڑ دوں
وہ مقابل آسماں اکثر کرے

منتظر میں ہوں کہ دستِ اعتبار
کب عنایت پیٹھ میں خنجر کرے

لرزشیں ساحل سے دامن گیر ہیں
وار جسمِ آب پر پتھر کرے

راحتیں منسوب ہیں اس شخص سے
روز کا معمول جو محشر کرے

یا بہم منظور ہوں آسائشیں
یا غمِ فردا کا وہ خوگر کرے

❖❖❖

○

جھُکا رکھا جو ہوتا سر انا کا
کہاں حقدار کہلاتا سزا کا

خبر ہوتی شقاوت کی جو اُس کی
ارادہ کون کرتا التجا کا

یہ کیسے راستوں پر چل پڑے ہم
نشاں اک بھی نہیں ہے نقشِ پا کا

قدم صحرا دہکتے چومتے ہیں
نوازش کیا کرم ہے رہنما کا

جھُلستے پھول کی یہ اضطرابی
ہے کتنا منتظر بادِ صبا کا

مقدّر پر کوئی در مہرباں ہو
کبھی جو مدعا سمجھے صدا کا

خشیّت سے لرزتی ہیں فضائیں
ہُوا ہے پھر کہیں کوئی دھماکا

ہوا منظور ہر اک درد زائل
مگر وہ روگ جو تھا ابتدا کا

❖❖❖

○

زندگی طرزِ اعتدال کہاں
خواہشِ دل کو ہے کمال کہاں

سانس لینے پہ بندشیں ٹھہریں
بات کرنے کا ہے سوال کہاں

کاروانِ جہاں چلائے کوئی
آدمی کی ہوئی مجال کہاں

چشمِ بینا کو نور سے رغبت
خار کو پھول سا جمال کہاں

سوچتا ہوں تو شرم آتی ہے
ہائے! گزرے ہیں ماہ و سال کہاں

روز دیکھوں شگاف چہرے پر
آئینے میں پڑے ہیں بال کہاں

درد فرسا کوئی نہیں منظور
زخمِ دل کا ہو اندمال کہاں

❖❖❖

○

مقدر پر اجارہ ڈھونڈتے ہو
شبِ یلدا میں تارا ڈھونڈتے ہو

یہ کس تحقیق میں ہو منہمک جو
فلک کا اینٹ گارا ڈھونڈتے ہو

خُدا بننے کی خواہش تو نہیں ہے
مطابق اپنے سارا ڈھونڈتے ہو

ابھی تم وسعتِ قطرہ سے غافل
سمندر کا کنارا ڈھونڈتے ہو

کہو! بستی سے کیا نبھتی نہیں ہے
بیاباں میں گزارا ڈھونڈتے ہو

بتا کس تشنگی کو سینکتا ہے
جو یخ میں بھی شرارا ڈھونڈتے ہو

وہیں ہوں گے محبت کے بھی پرزے
جہاں تم خط ہمارا ڈھونڈتے ہو

کہاں محفوظ اپنی جان منظورؔ
جو جینے کا اشارا ڈھونڈتے ہو

❖❖❖

○

خار کو گُل بنا کے رکھتے ہیں
دشمنی یوں اُٹھا کے رکھتے ہیں

کس کو حاصل ہو روشنی بھولیں
اپنی شمعیں جلا کے رکھتے ہیں

کون اندر زبان کھولتا ہے
کان خود سے لگا کے رکھتے ہیں

کچھ تکلف رہے تو اچھا ہے
کچھ تقاضے حیا کے رکھتے ہیں

کوئی منظر نہ زخم بن جائے
اپنی آنکھیں پھرا کے رکھتے ہیں

شور و غل کی ضرورتیں نہ پڑیں
خاموشی یوں بنا کے رکھتے ہیں

خاک کب ہوں خبر ذرا بھی نہیں
آسماں جو انا کے رکھتے ہیں

بچ گئے تو پرند لوٹیں گے
آ شجر کو بتا کے رکھتے ہیں

روشنی کھڑکیوں پہ ہے منظورؔ
کیوں نہ پردے ہٹا کے رکھتے ہیں

❖❖❖

○

وعدہ تھا آسمان کا دے دی زمیں مجھے
باعث شکستگی کا رہا ہم نشیں مجھے

خدشات کم نہیں ہیں دلِ نامراد کے
پھر بھی ترے خیال پہ کیوں ہے یقیں مجھے

طوفانِ آب سے ہی کہاں کار زار تھا
جنگیں تو ساحلوں سے بھی لڑنی پڑیں مجھے

جذبات کی غذا پہ ہی میری نمو بھی ہے
کیوں خواب دیکھنے کی اجازت نہیں مجھے

کیا جانے کون کون سے موسم سے ربط ہو
اک شخص لگ رہا ہے جمیل و حسیں مجھے

دن کے جو حادثات سے پوچھا تھا اک سوال
کتنی سزائیں رات کی دے دی گئیں مجھے

جس کے سبب سے گاؤں کی لاچارگی بڑھے
وابستہ ایسے شہر سے رہنا نہیں مجھے

سمجھے مری سرشت جو نکلا ہوں ڈھونڈنے
مل جائے ہم خیال سا کوئی کہیں مجھے

ناکام اک دعا کے سبب سے نہیں ہوئے
منظورؔ آزمائشیں کیا کیا رہیں مجھے

❖❖❖

○

اختلافات کے شکار ہیں ہم
خود پرستی سے داغ دار ہیں ہم

عالمِ بے خودی میں سرگرداں
ہے یہ دھوکا کہ ہوشیار ہیں ہم

دن کے اُسلوب کو پرکھنا ہے
شب کی نیّت سے آشکار ہیں ہم

گُل و لالہ بُجھے بُجھے سے ہیں کیوں
اس صعوبت کے ذمہ دار ہیں ہم

غیر مبہم کبھی نہیں ٹھہرے
راہِ ویران کا غبار ہیں ہم

جبر اور ظلم ہے رواج جہاں
ایسی بستی کے پاس دار ہیں ہم

عدل ہوگا رواج کب منظور
ایک مدت سے اضطرار ہیں ہم

❖❖❖

سرزد خطا ہوئی ہے کہیں انتخاب میں
آئے ہیں جس بنا پہ جہانِ خراب میں

جھلسا رہی ہے روز مرا جسم کیوں بھلا؟
کیا کیا سوال دھوپ نے پوچھے جواب میں

ساقی کا کچھ خیال نہ اپنی کوئی خبر
تنکے کی طرح بہہ گیا موجِ شراب میں

اب سر کی خیر ہو یا سجے دار پر کہیں
رکھے ہیں حوصلوں نے جو پاؤں رکاب میں

دھوتے نہ اپنی جان سے بروقت ہاتھ ہم
الزام قتل اور بھی ہوتے حساب میں

❖❖❖

اک داغ کیا ملا ہے رُخِ ماہتاب میں
اب نقص ڈھونڈتے ہیں دیے آفتاب میں

مہکا رہی ہے یاد کسی کی خیال و خواب
تازہ ہیں جیسے پھول ابھی بھی کتاب میں

ہوگی کبھی سحر بھی شبِ انتظار کی
گزرے ہیں ماہ و سال اسی اضطراب میں

چھونا بلندیوں کو گمانوں کی انتہا
کرگس بھی گھس گئے ہیں قطارِ عقاب میں

آب و ہوا کے چرخ کے تابع ہے زندگی
سانسوں کا انحصار قضا کے نصاب میں

تعذیب کی گرفت میں اہل چمن سبھی
منظور ایک گل ہی نہیں ہے عذاب میں

❖❖❖

O

آسان سے سوال پہ راہِ فرار کیوں
گزرا نہ قافلہ تو یہ گرد و غبار کیوں

شبنم کا التفات، نہ ہو دھوپ کی تھپک
آئے گا اپنے آپ ہی گُل پر نکھار کیوں

اتلاف تک تو آنکھیں تغافل شعار تھیں
دیوارِ شہر پر تھے لگے اشتہار کیوں

جولانیاں جو دریا میں ہوتی تھیں کیا ہوئیں
یوں منجمد ہوئے ہیں سبھی آبشار کیوں

کچھ دیر اپنی ذات کا بھی ہو محاسبہ
ناراض اس قدر ہے وہ پروردگار کیوں

ترکِ تعلقات ہی ضد کیوں بنی رہے
منظورؔ زخم گر ہے بنا غم گُسار کیوں

❖❖❖

یادداشت